معارف

فروری ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰/روپئے۔ فی شمارہ ۳۰/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

☽ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۷ ماہ جمادی الآخر ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۲۱ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

کووڈ-۱۹ کی سال بھر کی ہلاکت خیزیوں کی تلخ یادوں پر ابھی بھول جانے اور بھلا دینے کی وقت کی گرد بھی نہیں جمی تھی کہ ایک متوقع علاج و درماں کی تلاش میں ویکسین کا لفظ تیزی سے ضرور وردِ زباں ہونے لگا، مگر اس سے بھی زیادہ لوگوں کے ذہنوں اور زبانوں پر ذکر تھا تو امریکہ کے صدارتی انتخاب کے نتائج اور ان کے عملی ظہور میں آنے کا، ہر ملک، ہر قوم اور ہر طبقہ کو فکر تھی تو بس یہی کہ جانے والا کب اور کیسے جائے گا اور آنے والے کی راہ کب صاف اور ہموار ہوگی، جو گیا وہ جانے سے کچھ پہلے تک ایسے سیاست داں کی صورت میں دیکھا گیا کہ اس سے زیادہ بے باک، چالاک، وقت کی لہروں کا تیراک اور آتے جاتے لمحوں کا نباض کوئی اور اس کا مد مقابل نہیں، ذہنوں کو ماؤف اور نگاہوں کو مسحور کرنے کی وہی ادا تھی جو ہزاروں سال سے وقت کے جابروں کی شناخت رہی ہے، قوموں میں نفرت کا زہر پھیلا کر سرمایہ داری اور استعمار کے فروغ کے فن میں طاق، جو شکست کے نام سے گویا واقف ہی نہیں لیکن جب علو اور فساد کا وجود ذلت کی لہروں کے ذریعہ تہہ آب ہوا تو پھر ہمارے عالمی مبصرین بڑے اطمینان و یقین سے اس کو بدنہاد، بدمزاج، بدخو، بداندیش، بدطینت گویا مجسمہ بد کے الفاظ سے یاد کرنے لگے، یہ ان عالمی مسائل پر لکھنے والوں کا حق بھی ہے کہ وہ غیر کے پردے میں اپنی کسی دیرینہ بیماری یا دل کی ناگفتی کا علاج تلاش کرنے لگیں، وہ جہاں بھی ہیں وہاں کے حکمرانوں کے چہروں پر فرعون و نمرود کے خدوخال دیکھیں، کرگسوں کے جھنڈ میں اگر کوئی شاہین پلا بڑھا ہو تو اس کو فریب خوردہ ہی کہا جائے گا اور طعنہ بھی دیا جائے گا کہ ایسے شاہین کو رہ و رسم شاہبازی کی کیا خبر، ہمارے ملک کے کچھ صحافی جن کو دنیا کے حالات جاننے کی ضرورت اس لیے رہتی ہے کہ وہ ان حالات کے جھروکوں سے یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہے تو یہ دنیا، جہان گزراں ہی، پھر مردانِ صفا کیش و ہنرمند خوار کیوں ہیں؟ اب واقعہ یہی ہو یا کچھ اور، یہ حقیقت اپنی جگہ کہ جب ایک صدر مایوسی و تنہائی کے عالم میں دارابیض یا اس کے لیے دار فانی سے رخصت ہوا اور اس کی جگہ نئے فاتح کے وجود سے ایک نیا جہاں

آباد ہوا تو رنگ و آہنگ سب متغیر تھے، ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں، شکست و فتح کے یہ مناظر انسانوں کے لیے کبھی نئے نہیں رہے، لیکن جس طرح ایک طاقتور ملک کا سیاسی انتقال اس کی قوت و طاقت کو پوری دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنا گیا اور ہر براعظم کا ہر چھوٹا بڑا خطہ ارض جس طرح براہ راست اس مشاہدہ میں شریک ہوا، وہ گو ایسی حیرت انگیز بات نہ ہو لیکن کچھ دیر ہی کے لیے دل و دماغ یہ دیکھ کر حیران ضرور تھے کہ آخر ساری دنیا کی ساری نگاہیں ایک ہی منظر پر کیوں ٹکی ہیں، تجزیہ نگاروں، مبصروں اور ماہروں کی ایک فوج ہے جو ملک کے ہر ذریعہ ابلاغ پر اپنے مطالعہ اور تجزیوں اور معلومات کے دریا بہانے میں مشغول ہے، نئے حکمراں کے ایک ایک لفظ پر توجہ ہے، لفظ ہی کیا، لباسوں کے رنگ اور مجلس کے حسن روغن تک گفتگو کا مرکز ہیں، تقریر ہوتی ہے تو آغاز ہی میں ایک طنطنہ ہے کہ ''آج کا یہ دن امریکہ کا دن ہے، جمہوریت کا دن ہے، تاریخ کا دن ہے، ہم ایک عظیم قوم ہیں، ہم اچھے لوگ ہیں اور صدیوں کی جدوجہد اور طوفانوں سے لڑ کر یہاں تک پہنچے ہیں...... پورے کرۂ ارض سے تقاضائے بقا کی صدا آرہی ہے'' وغیرہ وغیرہ، دنیا سماعت میں محو حیرت تھی یہاں تک کہ نئے صدر کی اس افتتاحی تقریر کے ایک ایک حرف کو شمار کیا گیا، اتحاد آٹھ بار، تاریخ آٹھ بار، امریکن آٹھ بار، جنگ سات بار، باہم سات، کام چھ، عظیم چھ، سچائی پانچ، طاقت پانچ، محبت پانچ، انصاف پانچ، روح چار، وعدہ چار، امن چار، خدا چار، ملک چار، امید تین، دل تین، عقیدہ تین، یقین تین وغیرہ وغیرہ، دنیا کی بڑی قوت ہونے اور دکھانے کے کیسے کیسے بہانے۔

ایسے میں ان کے دلوں میں بھی جو کبھی اپنی جولان گاہ، زیر آسماں سمجھتے تھے، جن کا فقر کبھی ہلاک قیصر و کسریٰ تھا، یہ خیال آیا کہ آج پچاسوں ایسے ملک اور خطہ ہائے ارض ہیں جن پر مسلمان ہونے کا گمان ہی نہیں یقین بھی ہے، ان میں نہ افراد کی کمی ہے نہ وسائل کی، ان کے دامن میں دنیا کے خزانے ہیں، ان کے پاس ماضی کی قابل فخر روایتیں ہیں اور ہمت و شجاعت کی داستانوں کی میراث بھی، پھر ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں کہ جس کے ایک خطاب پر دنیا ہمہ تن گوش ہو جائے، جس کے منصوبوں اور عزائم سے دوسرے ملک اپنا طرز حکومت طے کریں، جن سے ایک ملاقات کے لیے برسوں سفارتی کوششیں عمل میں لائی جائیں اور جن کی ایک ایک ادا لائق تقلید ٹھہرے، کوئی تو ایسا ہو جو حیات کو خیال و

نظر کی مجذوبی ثابت کردے، جس کے لیے ضمیر پاک، نگاہ بلند اور مستی شوق کے سامنے دولت قارون اور فکر افلاطون بھی زبوں قرار پائے، تمناؤں اور آرزوؤں کا یہ ہجوم کسی پس ماندگی کا نتیجہ نہیں ہوسکتا، خیال آیا کہ ذرا دنیا کی اس پہلی باضابطہ اسلامی حکومت کے سربراہ کا پہلا خطاب دیکھا جائے، وہ اسلامی حکومت جس کے سامنے وقت کے قیصر وکسریٰ کے محلوں کے تمام کنگرے زمین پر آرہے، آہ! کیا خطاب تھا جو قریب پندرہ سو سال پہلے انسانیت کے سب سے ترقی یافتہ عہد کے آغاز کا اعلان تھا کہ اب حکومت واقتدار کے فرسودہ پیمانوں کے مٹ جانے کا وقت آیا، کاش اس خطاب کے ایک ایک لفظ و حرف اور اس میں پوشیدہ معانی کو شمار کیا جاتا، جب نبوت کی نیابت وتربیت کی زبان نے ساری دنیا کو پیغام دیا کہ ''لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم لوگوں میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری اعانت کرو اور برائی کی طرف لے جاؤں تو مجھے سیدھا کردو، سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے، تمہارا کمزور فرد بھی میرے نزدیک طاقتور ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلادوں اور تمہارا طاقتور فرد بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق دلادوں، جو قوم جہاد فی سبیل اللہ ترک کردیتی ہے اس کو خدا ذلیل وخوار کردیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری عام ہوجاتی ہے خدا اس کی مصیبت کو بھی عام کردیتا ہے، میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو لیکن جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر اطاعت نہیں''، اس افتتاحی خطبہ کی جتنی تشریح کی جائے وہ کم ہی رہے گی، حکومت وسیاست کا کون سا عقدہ ہے جس کی گرہ کشائی میں اس خطبہ کے ایک ایک لفظ کی معنویت کام میں نہیں آسکتی، ویسے مقام صدیقیت کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

اس شمارہ میں ترکی کے عالم شیخ یوسف صالح قراچہ کی وفات کا ذکر ہے، اتفاق سے چند دنوں پہلے سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم کا ترکی ترجمہ نئے اور دیدہ زیب طباعت والا موصول ہوا، ساتھ میں سفرنامہ روم و شام ومصر اور غزالی کے ترکی ترجمے بھی ہیں، الفاروق کا ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر طالب یاسر الپ کے قلم سے ہے، چاروں ترکی ترجمے جہاں علامہ شبلی کی مقبولیت کے ترجمان ہیں وہیں یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ ؎

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔

مقالات

ایک جدید مفسر کی قرآنی تعبیریات کا تعارف

پروفیسر تنویر عظمت

اس مقالے میں قرآنیات اور جدید مغربی فلسفے کے ممتاز عالم عرفان احمد خان (۱۹۳۱-۲۰۱۸ء) کی قرآنی تعبیریات (Hermeneutics) کا تعارف پیش کیا گیا ہے، عرفان احمد خان کے ان دو میدانوں میں اختصاص و مہارت کا ظہور ان کے اس جامع نظریے اور منہاج میں ہوا ہے جو انھوں نے قرآن حکیم کی تعبیر و تفہیم کے لیے پیش کیا ہے۔ فاضل مصنف کو ایک طرف تو جدید تعبیریاتی نظریے، تجزیاتی فلسفے، اور واقعاتی وجودیات (Event-Ontology) میں گہرا درک حاصل ہے جب کہ دوسری طرف قرآنی تفہیمیات (تعبیرات و تفسیریات) کے کلاسیکی (روایتی) اور جدید مناہج سے بھی گہری واقفیت حاصل ہے۔ عرفان احمد خان نے اپنی اس مہارت و واقفیت کو تعبیر و تفہیم قرآن میں خوب برتا ہے۔ تفہیم و تفسیر قرآن کے مناہج کی تدریس و تعلیم پر اپنی توجہ کے ارتکاز کی غرض سے انھوں نے اپنی تحریروں اور محاضرات (خطبات) میں فلسفیانہ اور تاریخی مسائل سے اعتنا نہیں کیا ہے۔ اس مقالے کا مدعا عرفان احمد خان کی قرآنی تعبیریات میں پنہاں فلسفیانہ اور قرآنی استدلالات کو دریافت کر کے انہیں مرتب اور منظم طور پر پیش کرنا ہے تاکہ اس پر بحث مباحثہ کی راہ ہموار ہو سکے۔

تعارف: عرفان احمد خان (۱۹۳۱-۲۰۱۸ء) کا شمار عصر حاضر کے اہم علمائے قرآنیات و جدید فلسفہ میں ہوتا ہے۔ ان کی قرآنی تفہیمیات (تعبیریات) کا کلاسیکی قرآنی تفسیری ادب سے موازنہ کیا جائے تو وہ ایک نئے رجحان اور اسلوب و منہج کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرفان احمد خان کی قرآنی تفہیمیات دراصل تفسیر و تعبیر قرآن کا ایک جامع نظریہ (Comprehensive Theory) اور منہج فراہم کرتی ہے۔ اس مقالے میں ان کی قرآنی اور فلسفیانہ تفہیمیات کی جہات اور

☆ لیکچرار: Wilbuer Wright College، شکاگو (ریاستہائے متحدہ امریکہ)۔

بالخصوص ان کے مندرجۂ ذیل جامع ومانع بیان: ''کسی فرد و بشر کی طرف سے کسی متن کی تفہیم کے عمل میں اس متن کے لفظی محتویات سے راست تعلق استوار کر کے اس کے مطالب ومعانی کے ادراک کی بصیرت (Insight) پیدا کرنا بھی شامل ہے'' (۴) کہ جس میں ان کی تفہیمات کا جوہر آ گیا ہے، کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اس مقالے میں عرفان احمد خان کی تفہیمات کے تعارف کے ضمن میں تنقیدی کے بجائے معلوماتی (انفارمیٹو) اور توضیحی منہاج اختیار کیا گیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ اسلوب اس مقالے کے مقصد اساسی کہ ''عرفان احمد خان کی قرآنی فکر و فہم کو مربوط و منظم انداز سے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے متعارف کرایا جائے'' کے حصول میں زیادہ مدد و معاون ہوسکتا ہے۔ بعض قارئین شاید اس مقالے کو عرفان احمد خان کے بارے میں ''ہمدردانہ'' خیال کریں۔ چنانچہ عرفان احمد خان کی فکر اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کا ایک بھرپور تنقیدی جائزہ بھی لیا جائے، جسے ہم ایک دوسرے مقالے کا موضوع بنائیں گے۔

سوانحی خاکہ: عرفان احمد خان سہارنپور (اترپردیش، بھارت) میں ۷ اپریل ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے، مدرسۂ ثانویہ سے فراغت کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے طبیعیات، کیمیا، اور ریاضی میں ۱۹۵۲ء میں گریجویشن کی۔ ۱۹۵۴ سے ۱۹۵۸ء کے دوران میں انھوں نے رام پور میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام قائم 'ثانوی درس گاہ' (۶) میں علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس درس گاہ میں انھوں نے مولانا جلیل احسن ندوی (م ۱۹۸۱ء) (۷) سے اکتساب فیض کیا۔ مولانا جلیل احسن اس درس گاہ کے ایک جید اور فاضل استاذِ تفسیر قرآن تھے۔ وہ مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) (۸) کے منہج تفہیم قرآن (نظم قرآن) سے گہرے طور سے متاثر تھے۔ (۹) اس منہج تفہیم قرآن کے رو سے نہ صرف قرآن کریم کی ہر سورت کی آیات میں معانی ومطالب کے اعتبار سے گہرا ربط و نظم پایا جاتا ہے بلکہ قرآن حکیم کی جملہ سورتوں اور آیات میں بھی ایک گہرا ربط و نظم پایا جاتا ہے۔ یوں قرآن حکیم ایک نہایت مربوط و منظم کتاب ہے۔ مولانا فراہی کے خیال میں ''نظم کسی کلام کی وہ واحد خصوصیت ہے جو اس کے معانی کی صحیح جہت کا تعین کرتی ہے''۔ (۱۰)

مولانا جلیل احسن کے دوسرے اساتذۂ تفسیر میں مولانا اختر احسن اصلاحی (م ۱۹۵۸ء) (۱۱) اور مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء) (۱۲) بھی شامل تھے، ان دونوں کا شمار مولانا فراہی (۱۳)

کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے۔ مولانا جلیل احسن بانی جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) کی اسلامی احیائی فکر سے بھی گہرے طور سے متاثر تھے۔ مولانا جلیل احسن ایک ممتاز محدث بھی تھے۔ رام پور کی ثانوی درس گاہ کے علمی ماحول کے زیر اثر عرفان احمد خان سائنس کو چھوڑ کر علوم دینیہ کی تحصیل و مطالعہ کی طرف مائل ہوئے، چنانچہ انھوں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر اسلامی کے ساتھ ساتھ فہم قرآن کی غرض سے مولانا فراہی کے نظریہ نظم قرآن سے بھی گہری واقفیت پیدا کی۔

رامپور کی ثانوی درس گاہ سے فراغت کے بعد عرفان احمد خان ۱۵ سال تک (۱۹۵۸-۱۹۷۳ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مغربی فلسفہ، اسلامی دینیات (Islamic Theology) اور ہندوستانی مذاہب کی تدریس میں مشغول رہے۔ علی گڑھ میں تدریس و تعلیم کے دوران میں انھوں نے بی اے دینیات اور ایم اے فلسفہ کی ڈگریاں حاصل کیں، ۱۹۷۴ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے شکاگو کی الینوئز یونیورسٹی (University of Illinois) چلے آئے۔ جہاں سے انھوں نے فلسفہ میں ایم اے (۱۹۷۷ء) اور پی ایچ ڈی (۱۹۸۶ء) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۶ء کے دوران میں وہ اسی یونیورسٹی میں اسلامی فلسفہ اور تصوف کی تدریس پر بھی مامور رہے۔ اسی عرصے کے دوران میں (ستمبر ۱۹۸۱ جون ۱۹۸۲ء) وہ شکاگو یونیورسٹی (University of Chicago) سے بطور استاذ زائر وابستہ رہے (۱۴)۔ اسّی کی دہائی کے آخر میں وہ Iowa یونیورسٹی (Iowa شہر) کے مدرسۂ ادیان (سکول آف ریلیجن)، شکاگو انسٹی ٹیوٹ کے مدرسۂ فنون اور امریکن اسلامک کالج (شکاگو) میں تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ (۱۵)

عرفان احمد خان کی قرآنی تفہیمات کی بنیاد قرآن و سنّت اور مغربی فلسفہ پر استوار ہے، فہمِ قرآن کے باب میں مولانا حمید الدین فراہی کے منہاج نظم قرآن کے تتبع میں ان کے یومیہ مطالعہ قرآن اور اس میں تدبر و تفکر کا دورانیہ ستر سالوں پر محیط ہے۔ عرفان احمد خان تجزیاتی فلسفہ (Analytical Philosophy) میں گہرا ادرک رکھتے ہیں (۱۶)۔ ان کے بیان کے مطابق، تجزیاتی فلسفہ کی روایت نے فلسفہ کو ماطبیعیاتی مسائل سے ہٹا کر اس کا رخ ٹھوس زمینی حقائق کی طرف پھیر دیا ہے۔ اس مقالے میں عرفان احمد خان کی تفہیماتِ قرآن کی انھی دو بنیادوں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (۱۷)

عرفان احمد خان کی وجودیات (آنٹالوجی) اور علمیات (اپیسٹی مالوجی): یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فلسفے اور قرآنیات کے مطالعہ میں عرفان احمد خان کا نکتۂ آغاز نوع انسانی کی وجودیات

(آنٹالوجی) سے ہوتا ہے، یہی آنٹالوجی ان کی علمیات کی تشکیل کا موجب ہوئی ہے۔ عرفان احمد خان کی نظر میں نوع انسانی کی وجودیات (آنٹالوجی) ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے ادراکی آلات وفعلیات (Perceptual Apparatus) کے عمل ادراک وتفہیم (انڈرسٹینڈنگ) کی بالائی اور زیریں حدود ہیں۔(۱۸) نوع انسانی کی علمیات کی زیریں حدانھیں خارجی دنیا کے مظاہر میں پائی جانے والی کلی وحدت (Integral Unity) کے ادراک سے باز رکھتی ہے۔ عرفان احمد خان حقیقی دنیا اور خارجی دنیا دونوں کو ایک جیسا نہیں گردانتے، وہ اپنے فلسفیانہ نظام (Frame wark) کی تشکیل میں خارجی دنیا سے مراد داخلی (باطنی) دنیا کے مقابلے میں ایک دوسرا عالم لیتے ہیں۔ چنانچہ اس فریم ورک کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ خارجی دنیا کے نہایت ٹھوس موجودات اور ان کے بارے میں ہمارے ادراک وفہم سے متعلق توضیحات پیش کرتے ہیں۔(۱۹) بطور مثال ایک سیب عرفان احمد خان کی خارجی دنیا کے موجودات میں سے ایک مظہر کی حیثیت رکھتا ہے اس خارجی دنیا میں نوع انسانی کا علمیاتی نظام سیب کی ہیئت وساخت کی کلی وحدت (Integral Unity) یعنی اس کے رنگ، وزن، اور ذائقے وغیرہ کی وحدت کے ادراک میں ناکام رہتا ہے۔ سیب کی حقیقت کے ادراک کی غرض سے نوع انسانی کا علمیاتی نظام اس وحدت کو فسخ کر دیتا ہے اور اس سیب کو اس کے تجریدی (Abstract) مظاہر کے مجموعے کی صورت میں دیکھتا ہے۔(۲۰) عرفان احمد خان کے خیال میں یہی چیز نوع انسانی کے علمیاتی نظام کی زیریں حد کا تعین کر دیتی ہے۔ کیونکہ کوئی انسان خارجی دنیا کے مظاہر کا کما حقہ ادراک نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ کسی خارجی وجود کی تفہیم کے لیے سب سے بہترین چیز جو کوئی انسان کرسکتا ہے یہ ہے کہ ان کے بارے میں بصائر (Insights) تشکیل دے یعنی ان کے ادراک کی استعداد پیدا کرے، ان کے بارے میں غور وتفکر سے کام لے اور ان کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرے۔ اس نوع کے بصائر (Insights) زندگی بسر کرنے (یعنی روز مرہ کے معمولات مناسب طور پر بجالانے، اور زندگی کے قیام وبقا اور اس کے تحفظ) کے لیے کافی ہیں۔

نوع انسانی کے علمیاتی نظام کی بالائی حد کے ادراک کے لیے عرفان احمد خان ایک عینی (خیالی) دنیا کی تعریف پیش کرتے ہیں کہ جس میں خارجی دنیا کے مظاہر عینی وخیالی دنیا کے ذیلی مجموعے (Subset) بن جاتے ہیں۔ یہ عینی وخیالی دنیا نہ تو ''نفسیاتی نوعیت کی دنیا'' ہے اور نہ ہی یہ ایک

موضوعی (Subjective) حقائق کی دنیا ہے۔(۲۱) عینی وخیالی اور حقیقی مظاہر وموجودات کے مابین فرق وامتیاز ان کے موضوعی (Subjective) اور معروضی (Objective) ہونے میں بھی نہیں ہے، بلکہ ان میں فرق وامتیاز کسی چیز کے ممکن بمقابلہ اس کے حقیقی (امکان بمقابلہ حقیقت) ہونے میں ہے، عرفان احمد خان کی رائے میں ''عینی وخیالی دنیا ان اشیا کی دنیا ہے جو قابل خیال، ممکن اور قیاس پذیر (Thinkables) ہیں اور یہ امکانات فکر وفہم کے امکانات ہیں''، اسے ہم محض اپنے تخیّل اور غور وفکر کے احاطے میں لا سکتے ہیں۔(۲۲) اس کے محتویات وموجودات (Existents) میں ''خارجی دنیا کے بارے میں صحیح یا غلط طور پر جو سوچا جا سکتا ہو یا کہا جا سکتا ہو (یعنی ہر قابل خیال، قیاس پذیر بات)'' شامل ہے''۔(۲۳)

خان صاحب کی رائے میں جہاں فکر واماندہ ہو جاتی ہے تو یہی مرحلہ ہماری معرفت کی بالائی حد قرار پاتا ہے(۲۴) تاہم نوع انسانی کی فکر میں اس کی ''سائنسی اور فنیاتی (Technological) پیش رفت نیز فلسفہ، ادب اور فنونِ لطیفہ میں ترقی کے سبب ارتقا کا سفر جاری وساری رہتا ہے۔(۲۵) بحث بالا کی بنا پر عرفان احمد خان اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فکر جو اپنی مائیت میں بعض حدود (limitations) رکھتی ہے، اپنے مراد ومدّعا (Object) کو دو طرح سے گرفت میں لاتی ہے:

۱۔ حقیقی وجودات کے فہم وادراک میں انسانی فکر اس جگہ جا کر رک جاتی ہے، جہاں وہ ان کی کلی وحدت کا ادراک نہیں کر پاتی۔ ۲۔ اسی طرح انسانی فکر اس جگہ جا کر رک جاتی ہے جب یہ عینی (خیالی) دنیا کے موجودات کے ادراک اور اسے احاطہ تصور میں لانے میں عاجز وواماندہ ہو جاتی ہے۔ (۲۶) ہم نوع انسانی کے فہم وادراک کی حدود کے مضمرات کا جائزہ اس مقالے کے دوسرے حصے میں لیں گے۔ ذیل میں ہم عرفان احمد خان کی قرآنی وجودیات اور علمیات کی کھوج لگائیں گے۔

عرفان احمد خان کا قرآنی فہم ان کی فلسفیانہ علمیات کے علاوہ نوع انسانی کی علمیات کے متعدد دوسرے پہلوؤں کو بھی آشکارا کرتا ہے، یہ دونوں علمیات (قرآنی اور فلسفیانہ) مل کر ان کا علمیاتی نظام تشکیل دیتی ہیں۔ اپنے مطالعہ وفہم قرآن کے رو سے عرفان احمد خان یہ یقین رکھتے ہیں کہ نوع انسانی کو زندگی بسر کرنے کے لیے درکار تمام صلاحیتیں، استعدادیں اور وسائل عطا کیے گئے ہیں۔ یہ صلاحیتیں اور وسائل درج ذیل پر مشتمل ہیں: ۱۔ حیاتیاتی (سمع، بصر اور فؤاد یعنی فکر ووجدان) ۲۔ روحانی (سمع،

بصر، فؤاد) ۳۔ خدا کی معرفت کی موہوبہ فطری صلاحیت واستعداد ۴۔ خیر وشر میں تمیز کا ودیعت شدہ شعور ووجدان نیز ۵۔ انبیا ورسل اور ان پر نازل شدہ وحی، گو یہ وسائل صرف انھیں (پانچ چیزوں) تک محدود نہیں ہیں۔ پیغمبرانہ وحی کی آخری شکل (Version) قرآن کریم ہے جسے عرفان احمد خان ''الفاظِ ربانی میں منزل من اللہ ہدایت کا نام دیتے ہیں'' (۲۷) (یعنی ہدایت کلام الٰہی کی صورت میں نوع انسانی کی کسی زبان میں نازل کی گئی)۔ ذیل میں ہم ان استعدادوں (Capabilities) کی تفہیم کی کوشش کریں گے، نیز اس امر کا بھی جائزہ لیں گے کہ یہ استعدادیں عرفان احمد خان کی نظر میں نوع انسانی کے فہم وادراک کی استعدادوں پر کس طور سے اثر انداز ہوتی ہیں۔

عرفان احمد خان کی نظر میں قرآنی اصطلاحات: سمع، بصر اور فؤاد وہ کلیدی وسائل ہیں جو حیاتیاتی اور اور روحانی سطح پر نوع انسانی کو عطا کیے گئے ہیں، (۲۸) کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ عرفان احمد خان جسم وروح کی ثنویت کے قائل ہیں؟ نہیں وہ ایسا ہرگز خیال نہیں کرتے، وہ نوع انسانی کو ان دونوں کی ایک خلقی ونامیاتی وحدت (Organic Unity) خیال کرتے ہیں، (۲۹) ان کے فہم قرآن کی رو سے حیاتیاتی وجود پہلے ظہور میں آتا ہے اور بعد میں اس میں سمع، بصر اور فؤاد جیسے روحانی ملکات پھونکے جاتے ہیں۔ یہ عمل تب ظہور پذیر ہوتا ہے جب رحم مادر میں اللہ کی طرف سے روح پھونکی جاتی ہے، (۳۰) وہ مادی وحیاتیاتی طور پر سمع، بصر اور فؤاد کی استعدادوں (ملکات) کے ثبوت میں حسب ذیل قرآنی آیت سے استشہاد کرتے ہیں: ''اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اور اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے، اس لیے کہ تم شکرگزار بنو''، (سورۃ النحل: ۷۸) عرفان احمد خان کے تصور فؤاد سے مراد تدبر وتفکر اور وجدان مراد ہے۔ ان کی رائے میں ''تفکر وتعقل، تدبر، تحلیل وتجزیہ'' اور اس نوع کے دیگر دماغی اعمال وافعال سب ''فؤاد'' سے منسوب ہیں، (۳۱) روحانی سطح پر سمع، بصر، فؤاد جیسی موہوبہ استعدادوں (ملکات) کے اثبات میں وہ حسب ذیل آیت سے استشہاد کرتے ہیں: ''جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے، پھر اس کو نِک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو''، (سورۃ السجدہ: ۷-۹) اس سطح پر عرفان احمد خان کے

تصور سمع، بصر اور فؤاد سے مراد روحانی اور مذہبی سچائیوں کو جانچنے کی نوع انسانی کی باطنی استعداد یعنی خالقِ کائنات کی طرف سے ودیعت شدہ ملکہ ہے۔ یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جسمانی سمع، بصر اور فؤاد کا مقصد و موضوع مظاہر فطرت ہیں جبکہ روحانی سمع، بصر اور فؤاد کا موضوع قرآنی آیات اور ان میں مضمر اسرار و حکم ہیں۔(۳۲)

نوع انسانی کے روحانی ملکات میں خدا کی طرف سے ودیعت کردہ شعورِ و وجدان خدا آگاہی (Godconsciousness) اور خیر و شر میں تمیز کا علم بھی شامل ہے،(۳۳) نوع انسانی کی داخلی و باطنی استعدادوں (ملکات) کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کے لیے اسے خارجی وسائل بھی عطا کیے ہیں (مثلاً پیغمبر اور ان پر نازل شدہ وحی ربانی، آسمانی صحیفے)۔(۳۴)

تاہم عرفان احمد خان اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن کے بعد کسی نئے پیغمبر اور نئی وحی کا امکان ختم ہو گیا ہے۔(۳۵)۔[دریں صورت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ] اگر خدائی ہدایت پانے کے لیے داخلی استعدادوں کے ساتھ ساتھ خارجی وسائل ضروری ہیں تو ان خارجی وسائل (پیغمبر اور وحی ربانی) کی عدم دستیابی کی صورت میں نوع انسانی کیونکر ہدایت پا سکتی ہے؟

عرفان احمد خان نے اپنی فلسفیانہ علمیات کو بروئے کار لاتے ہوئے اسی مسئلے کو اپنے غور و فکر اور بحث و گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے خیال میں، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسانی علمیات کی بالائی حد میں وسعت کا عمل جاری رہتا ہے اور نوع انسانی فہم قرآن کے لیے بہتر استعدادیں اور مہارتیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس خدا داد عطیے کے ساتھ ساتھ اس پر قرآن کریم کی تفسیر و تعبیر کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اس مسئولیت کا تقاضا ہے کہ بنی نوع انسان اس امر کے لیے پوری جد و جہد اور کوشش کریں کہ وہ اپنے آئندہ زمانوں (New Futures) کے لیے قرآن سے ہدایت اخذ کر سکیں۔ اب چونکہ ان میں کوئی پیغمبر نہیں آئے گا کہ جو ان کی تفسیر و تعبیر قرآن کی اصلاح کرے چنانچہ وہ اپنی تفسیر و تعبیر کے معیار و صحت اور اس کے نتائج و عواقب کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔ یوں عرفان احمد خان کی رائے میں کلام الٰہی کی تعبیر متناہی و غیر مطلق انسانی اذہان کے ذریعے متناہی و غیر مطلق نوع انسانی کے لیے کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی انسان صرف

اپنی تعبیر وتفسیر کے مطلق طور پر درست ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ عرفان احمد خان کی رائے میں تفسیر وتعبیر ایک ایسا عمل ہے کہ جو حقیقت کی نت نئی جہات کو پیہم منکشف کرتا رہتا ہے یعنی ایسے پہلو منکشف ہوتے رہتے ہیں کہ جن کا فہم وادراک پہلے ممکن نہ تھا۔ کلام الٰہی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تو کوئی تغیر وتبدیلی نہیں ہوتی، ان کی حیثیت تو ابدی اور نا قابل تغیر رہتی ہے البتہ قارئین کی استعداد معرفت میں ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ چیز علم ومعرفت کے امکانات کو بے پایاں وسعت وترقی سے ہمکنار کرتی رہتی ہے۔ (۳۶)

عرفان احمد خان کی تفہیمات کا دوسرا پہلو اس کی حرکی نوعیت ہے جس کے لیے وہ قرآن کریم سے استشہاد کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کا اپنی کائنات سے دوہرا تعلق ہے۔ اس ذات باری نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کو ہدایت عطا کرتا ہے: ''جس نے ہر چیز کو ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا'' (سورہ طٰہ: ۵۰)؛ ''(اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی'' (سورہ الاعلیٰ: ۱-۳)، (۳۷) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ذات باری نے ماضی میں کائنات کو تخلیق کیا وہی آج بھی تخلیق کر رہا ہے، اور آئندہ بھی تخلیق کرتا رہے گا، اسی ذات باری نے نوع انسانی کو ماضی میں ہدایت کے سامان سے سرفراز کیا، آج بھی وہی ہدایت عطا فرما رہا ہے اور آئندہ زمانوں میں بھی وہی ہدایت عطا فرماتا رہے گا، یعنی اس کی طرف سے نوع انسانی کی ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ یوں عرفان احمد خان تخلیق و ہدایت کے خدائی عمل کو ایک مسلسل وپیہم کائناتی مظہر گردانتے ہیں، جو اصل میں خدا کی فعالیت (God's Activity) کا طریق عمل (Modusoperandi) ہے، (۳۸) تاہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی نوعیت اور پیچیدگی کے مطابق اس کی ہدایت کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ (۳۹)

عرفان احمد خان کے فہم ومطالعہ قرآن کا اہم اور کلیدی نکتہ یہ ہے کہ ان کی نظر میں خدا تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات بشمول نوع انسانی کی ہدایت کا ذمہ اپنے اوپر لیا ہے۔ ربانی فعالیت (God's Activity) کے بارے میں عرفان احمد خان کا یہ تصور ان کی قرآنی تفہیمات کے ضمن میں گہرے مضمرات کا حامل ہے۔ اول یہ کہ ہم ایک حرکی کائنات میں رہتے ہیں جہاں ہر لمحے نئی تخلیق اور (نئی ہدایت) کا ظہور ہو رہا ہے۔ (یعنی ہر لمحہ ایک نیا تخلیق شدہ لمحہ ہے)۔ (۴۰) ایک ایسی کائنات میں،

خان صاحب کے خیال میں، قرآن کو ہر نئی نسل کے لیے اصلی واساسی ہدایت بننا ہے۔(۴۱)

چنانچہ اگر اسبابِ نزول کو فہم قرآن کی ایک لازمی شرط قرار دے دیا جائے تو قرآن صرف اپنے اولین مخاطبین کے لیے ہی ہدایت بن کر رہ جائے گا۔عرفان خان احمد خان کی نظر میں ''یہ طرز فکر و عمل ایک ایسی چیز جو اپنی ذات میں محکم ویقینی ہے (یعنی متنِ قرآن حکیم) کے ادراک وفہم کو ایک ایسی چیز کے تابع بنا کردے گا، جو اپنی ذات میں قرآن کی طرح محکم، قطعی اور یقینی نہیں ہے (یعنی اسبابِ نزول سے متعلقہ احادیث وروایات)''۔(۴۲) مزید برآں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ، زندگی میں نوع انسانی کا تجربہ بڑھتا رہتا ہے، نت نئے احوال وظروف کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور نت نیا سائنسی علم وجود میں آتا رہتا ہے۔ چنانچہ حالات وزمانہ کے تغیر کے ساتھ نسل انسانی کو تازہ اور نئی ہدایت کی احتیاج لاحق ہوتی ہے۔اس ضمن میں عرفان احمد خان یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ اگر ہم یہ خیال کریں کہ اساسی طور پر قرآن حکیم کے مخاطب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ تھے، تو اس میں وارد وہ آیات جن میں تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے ان کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے،(۴۳) نئے احوال وظروف پر ثانوی درجے کے خطاب تخاطب کے اطلاق کا تقاضا ہے کہ اصلی وحقیقی (Primary) صورت (Situation) سے عقلی ومنطقی قیاس ممکن ہو۔تاہم ہر نئی صورت حال کی توضیح عہد نبوی میں پیش آمدہ حالات وواقعات پر قیاس کرتے ہوئے ناممکن ہے،(۴۴) خان صاحب کی رائے میں جملہ اہم صورت احوال میں قرآن حکیم سے بالواسطہ طور پر ہدایت اخذ کرنا یعنی ہر نئی صورتِ حال کو عہدی نبوی کے احوال وظروف پر قیاس کرتے ہوئے کوئی حکم لگانا،'' ایسے نئے احوال وظروف کے ظہور کے امکان کو رد کردیتی ہے کہ جسے قرآن حکیم کے اولین مخاطبین کے عہد کے احوال وواقعات کی روشنی میں نہ سمجھا جاسکتا ہو'،(۴۵) اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ '' ایسے جملہ احوال وواقعات اور کیفیات کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا (یعنی ان کے بارے میں مبنی برحق وانصاف رائے نہیں قائم کی جاسکتی) کہ جن کے بارے میں متن قرآن میں راست طور پر خطاب نہیں فرمایا گیا ہے۔(۴۶)

انہی وجوہات واسباب کے سبب عرفان خان قرآن حکیم کی تفہیم بایں طور چاہتے ہیں کہ گویا وہ ابھی ہمارے ہی حالات وزمانے (ہمارے ہی سماجی وتاریخی احوال وظروف) میں اور خاص ہمارے ہی لیے بطور ہدایت نازل ہوا ہے۔کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ مسائل جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپؐ کی جماعت (صحابہ کرامؓ) کے عہد میں پیش آئے ان کی موجودہ دور کے قارئین کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے؟ خان صاحب کی رائے میں یہ سب ان مؤرخین کے لیے نہایت بیش قیمت اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس دور سے متعلق تاریخی بحث و تحقیق میں مشغول ہیں،(۴۷) البتہ ہمارے دور کے قارئین کے لیے، خان صاحب کی رائے میں، ان کی قدر و اہمیت اسی طرح سے ہے جیسے کہ قرآن کریم میں مذکور سابق انبیا کے قصص (عبرت و نصیحت کے اعتبار سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے لیے مفید اور اہم تھے،(۴۸) گویا قرآن کریم میں گزشتہ انبیا و رسل کے جو قصص بیان ہوئے ہیں، دور حاضر کے قارئین کے لیے ان قصص میں رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہؓ کے قصے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ گویا عرفان احمد خان یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انبیا کے قصص اپنے اندر ہر عہد کے قارئین کے لیے عبرت و تذکیر کا سامان رکھتے ہیں تا کہ وہ ان قصص سے اخلاقی سبق (عبرت و موعظت) حاصل کر کے اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں۔ البتہ یہ قصص کوئی ایسے حل پیش نہیں کرتے کہ جن کا اطلاق و انطباق بلا واسطہ طور پر یا ازراہ قیاس (اصلاً یا قیاساً) ہر نئے عہد کے حالات و مسائل پر کیا جا سکے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر قرآن کا خطاب اصلاً تمام زمانوں اور احوال کے لیے ہوتا تو اس بات کا امکان تھا کہ متن قرآن میں مستقبل میں پیش آنے والے حالات و مسائل کے لیے فراہم کی گئی ہدایت قرآن حکیم کے اولین مخاطبین کو (ان آیات و احکام کے اپنے عہد کے مسائل پر اطلاق و انطباق سے متعلق) خلجان میں مبتلا کر دیتی۔ عرفان احمد خان اس نوع کے امکانات کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ''قادر مطلق، علیم و خبیر، مبدی و صانع مصنف ایک ایسا ادبی شاہکار تخلیق کر سکتا ہے کہ جس سے بعض ابہامات کے باوجود، ہر عہد کے قارئین تازہ بہ تازہ تابش و درخشانی (Illuminations) حاصل کر سکتے ہیں اور ہر عہد کے لوگ اس کے ادبی محاسن سے متمتع و محظوظ ہو سکتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف (استعداد و قابلیت) کے مطابق اس کے اساسی و ضروری پیغام سے فیض یاب ہو سکتے ہیں،(۴۹) میری رائے میں خان صاحب کا مطمح نظر یہ ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے احوال و ظروف وقتِ موجودہ کے قارئین کے لیے کسی طور پر بھی کسی خلجان کا سبب نہیں بن سکتے، کیونکہ مستقبل کے امکانات ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، البتہ جب وقت موجودہ کا قاری گزشتہ دور کے قارئین کے فہم و تعبیر قرآن کی طرف دیکھتا ہے تو یہ چیز (طرز فکر و عمل) نئے حالات و

ظروف میں قرآن حکیم سے تازہ ہدایت کی بازیابی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

تفہیم قرآن کا ایک اہم ترین پہلو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت و کردار سے متعلق ہے۔ خان صاحب کی رائے میں سنت رسولؐ فہم قرآن کے لیے لازمی جزو کی حیثیت رکھتی ہے،(۵۰) ان کی رائے میں قرآن حکیم کی تفہیم کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ خود رسول اللہؐ نے قرآن حکیم کو اپنے عہد کے سماجی و تاریخی احوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھا اور پھر قرآن کے ذریعے اپنے صحابہ کا تزکیہ فرمایا اور اللہ سبحانہ کی نگرانی و ہدایت میں قرآنی بصیرتوں کی روشنی میں اپنے عہد کے سماجی و تاریخی احوال میں ایک انقلاب برپا کر دیا،(۵۱) آج مسلمانوں کو بھی وہی کچھ کرنا چاہیے یعنی قرآن حکیم کو اپنے عہد کے احوال وظروف کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بالفاظ دیگر خان صاحب کا منشا یہ ہے کہ ہر دور کے احوال وظروف میں قرآن حکیم کو اس طرح سے سمجھنا چاہیے کہ گویا وہ اسی دور کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں اور زیادہ پیچیدہ تجسیمات (Concretisations) ممکن ہیں، اگرچہ قرآن حکیم کی سب سے محکم و مکمل تجسیم وہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ظہور پذیر ہوئی، جو آپ نے اپنے عہد کے سماجی و تاریخی احوال وظروف میں اختیار کی،(۵۲) سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہؐ کی تجسیم کامل واکمل تھی تو آج نئی اور (اس سے) بہتر تجسیمات کس طرح ممکن ہیں؟ خان صاحب کی نظر میں پیغمبرانہ کمال سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے سماجی و تاریخی احوال وظروف میں آپ کی تجسیم کی اکملیت و کاملیت اور اس کے کسی نقص و کمی سے مبرا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم اس نوع کی اکملیت و کاملیت آئندہ زمانے میں پیچیدہ تر احوال وظروف جو متن قرآن کی زیادہ پیچیدہ تعبیرات کے متقاضی ہوں، ظہور کے امکان کو رد نہیں کرتی، اگرچہ یہ ان تعبیرات اور ان کے اطلاقات کے اکمال اور ان کے کسی نقص و فروگزاشت، اور لغزش و خطا سے مبرا ہونے کے امکان کو رد کر دیتی ہے۔ ان ملاحظات کے ساتھ ہی عرفان احمد خان کی وجودیات (آنٹالوجی) اور علمیات (Epistemology) جو ان کے فلسفیانہ غور و فکر اور قرآنی تدبر و تفکر پر مبنی ہے، پر بحث و گفتگو اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ذیل میں ہم خارجی دنیا اور متون کی تفہیم کے سلسلے میں عرفان احمد خان کے طریق کار کا جائزہ پیش کریں گے۔

تفہیمِ ''تفہیم'' (تفہیم کیا ہے؟): کسی متن کی لسانی دنیا ایک ایسے ذہن انسانی کا تقاضا کرتی ہے

جو متن تخلیق کر سکتا ہے، جب ایک متن روشنائی کی مدد سے یا کمپیوٹر کی اسکرین پر یا کسی اور ذریعے سے کاغذ کے کسی ٹکڑے پر بعض لسانی علامات کے روپ میں وجود پذیر ہوتا ہے، تو اسے مصنف کی اب کوئی ضرورت نہیں رہتی، اگرچہ اس متن کو اب بھی ایسے اذہان کی ضرورت رہتی ہے، جو اس کو پڑھ سکیں اور اس کی لسانی دنیا میں نفوذ کر جائیں۔ انجام کار عینی دنیا ان افکار و خیالات کی دنیا ہوتی ہے جو نوع انسانی کے اذہان میں موجود ہوتے ہیں۔ عینی دنیا کے وجودات (Entities) میں ہر وہ چیز شامل ہے جو انسان کے ذہن و خیال میں آسکتی ہے۔ یہ وجودات خارجی دنیا کے وجودات ہو سکتے ہیں، خارجی دنیا کے امکانات اور حتیٰ کہ خارجی دنیا کے ناممکنات بھی ہو سکتے ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت وصراحت کے لیے ایک سیب کی حسب ذیل مثال کافی ہوگی۔ سیب خارجی دنیا میں موجود ہوتا ہے قطع نظر اس کے کہ کوئی غور وفکر کرنے والا ذہن موجود بھی ہے کہ نہیں، جبکہ لسانی دنیا میں یہ ایک لسانی علامت (مثلاً ''ایپل''، انگریزی زبان میں) کے طور اپنا وجود رکھتا ہے جبکہ عینی دنیا میں یہ ''سیب'' کی تصویر (Image) کے طور پر اپنا وجود رکھتا ہے، تینوں دنیاؤں کے وجودات وتکوّنات (Existences) کے امکانات کے اعتبار سے، سیب خارجی دنیا کی ایک واقعیت (Actuality) ہے۔ لسانی دنیا میں ''سیب'' خارجی دنیا کا ایک حقیقی امکان ہے۔ تاہم لسانی دنیا میں خارجی دنیا کے ناممکنات بھی پائے جا سکتے ہیں، مثلاً اس بیان: ''بلی کے قد کاٹھ کا ہاتھی'' میں ''ہاتھی'' کا لفظ حقیقتاً لسانی دنیا میں اپنا وجود رکھتا ہے، اگرچہ خارجی دنیا میں یہ ناممکنات میں سے ہے۔ یہ خارجی دنیا کا ایک عدم امکان ہے کیونکہ اپنی پیدائش کے وقت سے ہی ہاتھی کا قد کاٹھ بلی سے کہیں بڑا ہوتا ہے، اور اس کے بعد سے مسلسل اس کی جسمانی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ عینی ومثالی دنیا میں خارجی دنیا کے امکانات (بطور مثال ایک سیب)، خارجی دنیا کے قابل تصور ناممکنات (مثلاً بلی کے قد کاٹھ کا ہاتھی) اور خارجی دنیا کے ناقابل تصور ناممکنات، مثلاً گول مستطیل (Round Rectangle) کا وجود پایا جاتا ہے۔

اب ہم ان تعریفات کا اطلاق خارجی دنیا کے کسی وجود (مثلاً سیب) کی تفہیم کے عمل (Process) کے ادراک پر کرتے ہیں (بطور مثال ایک سیب) تو اس سلسلے کا پہلا قدم سیب کو خارجی دنیا میں دیکھنا ہے۔ تب ہم اس کے جملہ تجریدی وجودات وجواہر (Abstract Entities) اس کے رنگ، شکل، وزن وغیرہ کے مجموعے کی حیثیت سے اس کے بارے میں اپنی عینی وخیالی دنیا میں ایک تصور قائم

کرتے ہیں، یہ عمل ہمیں خارجی دنیا میں سیب کی مائیت کے بارے میں ایک بصیرت (Insight) فراہم کرتی ہے۔ انجام کار ہم اس کے لیے ایک لسانی علامت ''سیب'' مختص کردیتے ہیں۔ مستقبل میں جب بھی خارجی دنیا میں ہمارا سامنا سیبوں سے ہوگا تو ہم بآسانی ''سیب'' کی علامت (اس کے لیے وضع شدہ لفظ) نیز اس وجود کے بارے میں ہمارے ذہن میں قائم تصور کو ذہن میں لاتے ہوئے خارجی دنیا میں اس کو دیگر موجودات وتکوّنات سے ممیز کرسکتے ہیں، یوں خارجی دنیا کی تفہیم کا عمل خارجی دنیا کے اشیا و وجودات (Entities) سے شروع ہوکر عینی ومثالی دنیا سے ہوتا ہوا لسانی دنیا تک سفر کرتا ہے)۔

متون کی تفہیم کے عمل میں یہ تینوں دنیائیں، ایک معمولی سے فرق کے ساتھ شامل ہوتی ہیں، جب ہم کسی متن کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارا سامنا خارجی دنیا کے اشیا و وجودات (Concrete Particulars) کے بجائے لسانی علامات (کسی خاص زبان کے حروف میں لکھے ہوئے الفاظ) سے ہوتا ہے۔ ہماری خواندگی ہمارے سامنے موجود متن کی لسانی علامات پر مبنی ایک عینی ومثالی دنیا کی تخلیق کا تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ ہم عینی ومثالی (خیالی) دنیا میں موجود لسانی علامات کی وساطت سے لسانی دنیا کے ادراک کی کوشش کرتے ہیں، لسانی دنیا کے بارے میں ہمارے بصائر (Insights) خارجی دنیا میں صحیح اور غلط بھی ہوسکتے ہے۔ کیونکہ لسانی علامات خارجی دنیا کی ممکنہ اور ناممکنہ واقعیات (Actualities) ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے بصائر (Insights) کو اپنی زندگیوں میں برت کر ان کی صحت اور عدم صحت (صدق کذب) کا پتہ چلائیں۔ یوں متون کی تفہیم کا عمل لسانی دنیا کے ادراکات و بصائر (Insights) کی صحت یا عدم صحت کا کھوج لگانے کے لیے لسانی دنیا سے ہوتا ہوا عینی دنیا اور پھر خارجی دنیا کی طرف سفر کرتا ہے۔

متون کی تفہیم کا جو طریق اوپر بیان ہوا ہے اب ہم، اس کا اطلاق قرآن حکیم کی تفہیم کے لیے بروئے کار لاتے ہیں یعنی ہمارے سامنے ایک متنی دنیا ہے جو تعبیر وتفسیر کی منتظر ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ اس کی علامات کو درست طور پر یا جس حد تک انسانی استعداد کے لیے ممکن ہے Decipher کیا جائے یعنی ان کی رمز کشائی کی جائے اور ان کے معانی دریافت کیے جائیں۔ اگر ہم اس طریق عمل میں غلطی کر بیٹھیں تو ہم قرآن حکیم کو درست طور پر سمجھ نہ پائیں گے۔ تفہیم قرآن کے لیے جو منہاج عرفان احمد خان نے تجویز کیا ہے وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم قرآن کی متنی علامات کو

محض قرآن کے ذریعے سے سمجھیں،(۵۳) عرفان احمد خان قرآنی لسانی علامات کے معانی کی تعیین کے لیے مطالعہ علم اشتقاق اور صرف ونحو، استخدام اسباب نزول، مطالعہ ناسخ ومنسوخ اور آیات محکمات و متشابہات وغیرہ کی معرفت پر انحصار کو ایک غلط اقدام گردانتے ہیں،(۵۴) جہاں تک کتب تفاسیر کا تعلق ہے، عرفان احمد خان انھیں نظر انداز نہیں کرتے، البتہ ان کی رائے میں ان تفاسیر کی طرف رجوع سے قبل ضروری ہے کہ قارئین تفکر وتدبر سے کام لیں اور اپنی طرف سے متن کی تفہیم وتعبیر کے لیے پوری پوری سعی و کاوش کریں۔ اس باب میں عرفان احمد خان متقدمین مفسرین کو اساتذہ تصور کرتے ہیں۔ تاہم ان کی رائے میں طلبہ کو متن قرآن کی تفہیم کے لیے اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے، یہ تصور کرتے ہوئے کہ گویا قرآن کریم کا متن ان کی ذاتی زندگی کے احوال ومسائل میں ان کی رہنمائی کے لیے راست طور پر ان سے مخاطب ہے۔ اس کے بعد خان صاحب ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنے ادراک وفہم کی دیکھ پرکھ، یا اس کی تصدیق وتوثیق اور اثبات واستناد کے لیے متقدمین مفسرین کی طرف رجوع کریں۔ تاہم ان کی رائے میں متقدمین مفسرین (اساتذہ) اس باب میں کوئی حتمی استناد وحجت نہیں ہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ انھوں نے متن کو صحیح طور پر نہ سمجھا ہو یا اپنے زمانے (اپنی زندگی) کے ایسے خاص احوال وظروف کے تناظر میں سمجھا ہو، جو متغیر ہو گئے ہوں اور اپنی اصل حالت پر باقی نہ رہے ہوں۔ خان صاحب اپنے تلامذہ سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ متقدمین مفسرین کے فہم و ادراک سے پرے نکل جائیں اور ان کے فہم وادراک سے آگے بڑھ کر قرآن کے معانی ومطالب کا کھوج لگائیں۔ ان کی نظر میں فکر کے ارتقا کا یہی راستہ ہے۔ چنانچہ خان صاحب ہم سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنے اساتذہ (متقدمین) سے سیکھیں، اپنے بصائر (Insights) کا موازنہ ومقابلہ ان کے بصائر (Insights) سے کریں اور پھر آگے کی طرف پیش قدمی کریں نہ کہ اپنے متقدمین کے افکار وخیالات کے مقلد بن کر رہ جائیں۔(۵۵)

عرفان احمد خان اس نقطۂ نظر کی تائید میں حسب ذیل دلائل لاتے ہیں: ۱۔قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر وتبیین بیان کرتا ہے (القرآن یفسر بعضہ بعضا) ۲۔کسی متن کا ادبی تناظر الفاظ کے معنی کا تعین کرتا ہے۔ ۳۔قرآن ایک نہایت منظم ومربوط متن ہے اور اس کا نظم (آیات وسور کا ارتباطِ باہمی) قرآنی متن کی دنیا کی مناسب ودرست طور پر تفہیم کے لیے

نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ۴۔ قرآن کو ہم اپنے موجودہ سماجی و تاریخی تناظر میں ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ۵۔ کسی بھی انسان کے فکر و فہم کو حتمی و دائمی نہیں گردانا جا سکتا، خواہ یہ فکر و فہم ہمارے برگزیدہ متقدمین ہی کا کیوں نہ ہو، (۵۶) ''صرف اپنے حاضرہ احوال وظروف کے تناظر میں متن کی تفہیم'' کا مسئلہ خان صاحب کے تصور تغیر و تبدیلی (Change) سے گہرے طور سے جڑا ہوا ہو، جس پر ہم آئندہ سطور میں بحث کریں گے۔

ہم قرآن کریم کو کیسے سمجھیں، اس ضمن میں عرفان احمد خان کے مذکورہ بصائر (Insights) ہمارے لیے فہم قرآن کے سلسلے میں گہرے مضمرات کے حامل ہیں۔ عرفان احمد خان کی علمیات سے مترشح ہوتا ہے کہ کسی متن کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قارئین اس دنیا پر ایمان و یقین رکھیں جو متن ان کے روبرو تخلیق (پیش) کرتا ہے۔ بطور مثال اس بیان ''بلی کے قد کاٹھ کا ہاتھی'' سے جو متنی دنیا تخلیق ہوتی ہے اس پر قاری کو من وعن یقین رکھنا چاہیے تاکہ اس کہانی کے دیگر اجزا کی ٹھیک طور پر تفہیم کی جا سکے۔ اس میں یہ امر مضمر ہے کہ اہل ایمان اور کافر (غیر اہل ایمان) جب قرآن پڑھیں تو جب تک وہ متنی ادراکات (Insights) کی یافت کے لیے اس کی متنی دنیا میں موجود رہیں تو ان سب (دونوں گروہوں) کو قرآن کی متنی دنیا پر ایمان رکھنا ہوگا۔ تاہم جب وہ خارجی دنیا میں آجائیں تو قرآنی حقائق اور صداقتوں کے قبول یا عدم قبول کا فیصلہ کریں، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عرفان احمد خان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قرآنی تفہیم پوری نوع انسانی کی کدوکاوش پر منحصر ہے، (۵۷) چنانچہ اس کدوکاوش میں غیر مسلموں کو بھی خوش آمدید کہنا چاہیے تاکہ وہ بھی اپنے مطالعے اور غور وفکر سے قرآن کریم کے متن کی تفہیم میں (جس میں تنقید بھی شامل ہو سکتی ہے) اپنا کردار ادا کریں۔

تبدیلی کی مائیت: عرفان احمد خان کو تبدیلی کی ماہیت نیز اس کے وقوع کی نوعیت سے فلسفیانہ اور عملی دونوں اعتبارات سے دلچسپی ہے، ان کے فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے خارجی دنیا کے موجودات میں تبدیلی وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی دیکھی جا سکتی ہے البتہ کسی خاص لمحے میں اس کا مشاہدہ ممکن نہیں، جب ہم وقت کے کسی خاص لمحے موجودات کو دیکھتے ہیں تو ہم انھیں بطور اشیا دیکھتے ہیں، جب ہم زمان کے اعتبار سے دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں واقعات معلوم ہوتے ہیں، (۵۸) عرفان احمد کی رائے میں تبدیلی کا ادراک ہم صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں جب اس کا کوئی خاص نقطۂ آغاز اور نقطۂ اختتام ہمیں

معلوم ہو، کہ ان دونوں کے درمیان ہی تبدیلی کا ادراک ممکن ہے، عرفان احمد خان کا یہ نظریۂ تبدیلی ان کی تعبیریات (تفہیمیات) کے لیے گہرے مضمرات کا حامل ہے۔ ان کی رائے میں، وہ واحد چیز جو پوری طرح سے قارئین کو دستیاب ہوتی ہے وہ موجودہ سماجی و تاریخی احوال و ظروف ہوتے ہیں جن میں مطالعہ متن وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہماری تفہیم کا نقطۂ آغاز صرف ہمارے وہ موجودہ سماجی و تاریخی احوال ہوتے ہیں جو پوری طرح سے ہمیں میسر ہوتے ہیں اور جن میں ہمیں مسائل درپیش ہوتے ہیں، ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے بصائر (Insights) حاصل کرتے ہیں پھر ان کے مطابق اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسا کرنے میں ایک اتفاقی و بے مقصد تبدیلی کا نہیں بلکہ ایک مقصدی و بامعنی جہت کا تعین ہوجاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم اپنی تبدیلی کا جائزہ بایں طور لیتے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا اور اپنے مطالعہ وفہم (قرآن) کی روشنی میں کس جہت کو سفر کیا، (۵۹) اگر مطلوبہ تبدیلی حاصل نہ ہوئی ہو تو ہم مکرر قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور انکشاف حقائق کی جستجو میں لگے رہتے ہیں حتی کہ ہم زندگی میں درپیش مسائل کے قابل قبول حل کی دریافت میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

عرفان احمد خان صاحب نے حالیہ مسلم تاریخ میں بعض اسلام پسندوں کے تصور تبدیلی کے بعض غلط پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس نوع کی غلطی کرنے والوں کا نمائندہ گردانتے ہیں۔ اس ضمن میں عرفان احمد خان کے تنقیدی ملاحظات پوری شرح و بسط سے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے نام ان کے خط (محررہ ۱۲/اگست ۱۹۷۸ء) میں آگئے ہیں، (۶۰) اس خط کے مندرجات کے رو سے عرفان احمد خان اور سید ابوالاعلیٰ مودودی دونوں اسلام کو ایک پیہم ارتقاپذیر (حرکی) تحریک گردانتے ہیں جس کا آغاز نوع انسانی کی تاریخ میں سب سے پہلے اللہ کے پہلے رسولؑ نے کیا اور جس کا سلسلہ اللہ کے آخری رسول اور نبی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک بلا انقطاع جاری رہا۔ ان دونوں کے ہاں اس تحریک کا جوہر حقیقی ''توحید'' یعنی صرف اور صرف ایک اللہ کی عبودیت ہے۔ سید مودودی اور عرفان احمد خان کے ہاں توحیدی تحریک کا مقصد فرد (مرد و عورت) اور اس کے معاشرے میں ''ایک نہایت اہم، آفاقی اور اساسی و جوہری تبدیلی برپا کرنا ہے''، (۶۱) تاہم عرفان احمد خان کو یقین ہے کہ سید مودودی کے ہاں انقلابی جوش و جذبے اور فعالیت پسندی (Activisim) میں غلط و

ناموزوں جوڑ (عدم توافق) نظر آتا ہے۔خان صاحب کی رائے میں یہ غلط یا ناموزوں جوڑ اس وقت رونما ہوتا ہے جب ہم مستقبلیت کے مغالطے (Fallacy of futurism) میں جا پڑتے ہیں (۶۲) ''مستقبلیت کے مغالطے'' سے خان صاحب کی مراد یہ ہے کہ (اسلامی انقلاب پسندوں کے ہاں) اچھے اسلامی (مسلم) کردار و شخصیت اور ایک اخلاقی معاشرے کے قیام کا حقیقی عمل مستقبل میں وجود میں آتا ہے جبکہ حال میں صرف سیاسی سرگرمی پر مشتمل ایک جعلی و مصنوعی اور غیر حقیقی عمل انجام پاتا ہے۔ (یعنی عملی سیاست کو صحیح اسلامی کردار و شخصیت اور اخلاقی معاشرے کے قیام پر، جسے حقیقت میں دیگر سب کاموں اور سرگرمیوں پر فوقیت و ترجیح حاصل ہونی چاہیے تھی، تقدم حاصل ہو جاتا ہے)۔ سیاسی فعالیت کا مقصد دوسروں کو اپنا ہمنوا بنانا (یعنی دوسروں کے نقطۂ نظر کو اپنے نقطۂ نظر کے موافق بنانا) اور انتخابات میں جیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جب سیاسی قوت و اقتدار ہاتھ میں آجائے تب ہی کہیں اسلام کا حقیقی کام شروع ہوتا ہے، (۶۳) اس مغالطے کے برعکس، خان صاحب کا خیال ہے کہ حقیقی تبدیلی نوع انسانی کے قلب و ذہن کی تبدیلی ہے، یا اس کے تصور حیات و کائنات (World view) کی تبدیلی ہے۔ (۶۴)

عرفان احمد خان کی رائے میں اسلام جوہری طور پر ایک روحانی انقلاب کا نام ہے محض سیاسی نظام میں تبدیلی کا نام نہیں، البتہ روحانی تبدیلی کے نتیجے میں مستقبل میں کسی وقت (کبھی) سیاسی تبدیلی بھی برپا ہو سکتی ہے، البتہ ضروری نہیں ہے کہ لازماً سیاسی تبدیلی بھی برپا ہو جائے، (۶۵) عرفان احمد خان کی نظر میں روحانی انقلاب کی اساس قرآن حکیم کی حسب ذیل آیت ہے: ''اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہ'' (سورہ ہود: ۲۶) اس ادراک و بصیرت (Insights) کے ذریعے ایک ''تبدیلی''، ''تعمیر''، اور ''انسانی سیرت و اخلاق کی نشوونما'' وقوع پذیر ہوتی ہے، (۶۶) چنانچہ اس عقیدے اور نظریے کی ''عملی تعبیر (Realisation)''، ایک ''وعدۂ ایفا''، ''سمت و جہت کی تبدیلی'' اور ''ایک نئے خاندان اور قافلے میں شمولیت'' سے عبارت ہے، (۶۷) اپنے مطالعہ و تدبر قرآن کی بنیاد پر عرفان احمد خان اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ ''خاندان'' خدا تعالیٰ، انبیا و رسل، فرشتوں، اور اہل ایمان مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتا ہے، (۶۸) یہاں عرفان احمد خان کی ''تعبیریات'' کی ایک آفاقی و کونیاتی جہت ہم پر منکشف ہوتی ہے۔

عرفان احمد خان ''مستقبلیت کے مغالطے اور واہمے'' کو قرآن کے تصور مذہب ''الدین'' (۶۹) کی روح کے شدید منافی خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں دین کی روح یہ ہے کہ موجودہ احوال و ظروف ہم پر خاص طرح کی ذمہ داریاں (مسئولیات) عائد کرتے ہیں اور جن کے ایفا وعدم ایفا کے ضمن میں ہم اپنے رب کے حضور جواب دہ ہیں، (۷۰) اس سے خان صاحب کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس چیز کے لیے اپنے خدا کے سامنے جواب دہ ہیں، اس کا بڑی حد تک دارو مدار دنیائے انسانی کی موجودہ صورت احوال سے ہے، جہاں انسانی متناہیت ومحدودیت (Finitude) کے سبب بعض چیزوں میں تبدیلی ممکن ہے اور بعض میں ناممکن، اس سے یہ بھی مراد ہے کہ موجودہ احوال وظروف ہی مستقبل کے اعمال وافعال (اقدامات) کا تعین کرتے ہیں، یوں خان صاحب کی نظر میں سید مودودی اسلام کو ایک ''نظام'' اور ''اٹل اور جامد وغیر متغیر خیالات وعقائد'' کا ایک مجموعہ تصور کرتے ہیں، جبکہ وہ خود اپنے تئیں اسلام کو اجتماعی فکر وعمل کا ایک حرکی اور تغیر پذیر عمل (Process) گردانتے ہیں، (۷۱) اسلام کے بارے میں اس نوع کا تصور تبدیلی کو اپنی ماہیت وفطرت میں عضوی ونامیاتی (خلقی) خیال کرتا ہے، کیونکہ یہ تبدیلی کو ایک حیاتیاتی عضویے (Biological Organisms) کے مشابہ قرار دیتی ہے (جس کے رو سے) داخلی (باطنی) دنیا کا خارجی احوال وظروف سے تعامل وتفاعل ہی راہ عمل کا تعین کرتا ہے اور احوال وظروف کی تبدیلی وتغیر کے ساتھ ساتھ یہ راہ عمل (Course of Action) بھی حرکی طور پر تغیر پذیر ہوتا ہے۔ (۷۲)

عرفان احمد خان قرآن حکیم کو ذہن و کردار کی تبدیلی کا ایک وسیلہ (Instrument) تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی توجہ قرآن حکیم سے راست طور پر (Direct) شخصی تعلق استوار کر کے اپنے ذاتی غور وفکر سے اس کی تفہیم کی طرف منعطف ہوجاتی ہے، عرفان احمد خان قرآن کو ایک ''تحریری الہام ووجدان'' یا ایک ''محفوظ ادراک وبصیرت (Insight)'' تصور کرتے ہیں، (۷۳) یوں تبدیلی کا منہج فہم قرآن اور اس پر عمل پیرا ہونے، اور ''النور'' یا ''کتاب مبین'' کی روشنی میں زندگی گزارنے کا منہج بن جاتا ہے، (۷۴) یہ عمل ''کلمہ طیبہ'' کی طرح ہے جس کی معنوی افزائش وترقی (ارتقا) کا عمل ہر آن جاری رہتا ہے، (۷۵) عرفان احمد خان کا یہ تصورِ قرآن سید مودودی کے تصورِ قرآن سے بہت حد تک مختلف ہے، کہ جس میں قرآن محض اوامر واحکام کا ایک مجموعہ بن جاتا ہے، کہ جن کی کسی خاص سیاسی نظام میں

تنفیذ واجرا سے مطلوبہ تبدیلی رونما ہوجاتی ہے۔ یوں عرفان احمد خان کی نظر میں قرآن سے ادراک و بصیرت (Insight) کا حصول اور اس کے مطابق زندگی کی ترتیب و تنظیم اور موجودہ احوال وظروف میں انسانی عقل وفہم کے استعمال وغیرہ، سب چیزوں سے مل کر قرآن حکیم کی تفہیم کا صحیح صحیح عمل (Process) تشکیل پاتا (وقوع پذیر) ہے۔ عرفان احمد خان کا خیال ہے کہ سید مودودی کے منہج فہم قرآن کے اتباع کا حتمی نتیجہ ایک دھرم (Cult) کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔(۷۶)

عرفان احمد خان کا جامع بیان: عرفان احمد خان کے اس جامع بیان کہ "کسی فرد و بشر کی طرف سے کسی متن کی تفہیم کے عمل میں، اس متن کے لفظی محتویات سے راست (Direct) تعلق استوار کرکے اس کے معانی ومطالب کے ادراک کی بصیرت پیدا کرنے کی پوری پوری سعی وکوشش شامل ہوتی ہے" نے بڑی حد تک ان کے تفہیمیاتی نظریے (Hermeneutics theory) کا احاطہ کرلیا ہے۔ اس بیان میں حسب ذیل نکات توضیح طلب ہیں: ۱۔ "کسی متن کی تفہیم کا عمل" ۲۔ "اس کے معانی ومطالب تک رسائی کے لیے ادراک وبصیرت (Insight) کی افزائش ۳۔ اس کے لفظی محتویات ۴۔ لفظی محتویات سے راست ربط وتعلق کی استواری، دلچسپ بات یہ ہے کہ عرفان احمد خان قرآن حکیم سے ربط وتعلق کی استواری سے قبل ہم سے علم اصولِ تفسیر (فہم قرآن کے کلاسیکی اصول تفسیر) کی معرفت کا تقاضا نہیں کرتے، (۷۷) جبکہ علما عمومی طور پر اس کا تقاضا کرتے ہیں یا پھر زیادہ تر مسلمان مضمراً (Implicitly) یا صراحتاً (Explicitly) قرآن حکیم کی صحیح تفہیم کی غرض سے اصول تفسیر کے پیشگی علم کو لازمی شرط تصور کرتے ہیں۔ عرفان احمد خان کی مراد یہ ہے کہ اصول تفسیر کا منہاج قرآن حکیم کی تفہیم کے لیے ایک نہایت نادرست وغیر موزوں منہج ہے، (۷۸) وہ اصول تفسیر کے کلاسیکی منہج سے صرف یہ واحد اصول اخذ کرتے ہیں کہ "قرآن کو قرآن کے ذریعے سمجھا جائے" (کیونکہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً)۔

عرفان احمد خان کے مذکورہ جامع بیان کا پہلا حصہ: "کسی متن کی تفہیم کا عمل"، ہمیں اس امر سے آگاہ کرتا ہے کہ تفہیم ایک عمل (فعل) کا نام ہے۔ یہ فعل، خان صاحب کے ہاں عمل (Process) کا نام ہے نہ کہ یک وقتی سرگرمی (Action) کا، (۷۹) یہ عمل (Process) ایک پیہم و مسلسل سرگرمی سے عبارت ہے۔ پیہم و مسلسل مطالعے کا عمل عرفان احمد خان کے تصور علمیاتِ نوع انسانی (Humankind's

(Epistemology) پر استوار ہے۔ کیونکہ ان کے تصور علمیات کے رو سے نوع انسانی کے فہم و ادراک کی بالائی حد کی سرحد تو ہے البتہ وہ متعین و مستقل و متحجر نہیں ہے۔ اس کے علم، تجربۂ زندگانی اور احوال و ظروف میں امتداد زمانہ کے ساتھ تغیر و تبدیلی کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور وہ نئی تعبیرات کے مواقع لے کر آتے ہیں۔ یوں قرآنی تفہیم کا یہ عمل (Process) ادراک و تفہیم کی نت نئی جہات کو وا کرتا ہے، جو کہ اس سے قبل زمانوں میں ممکن نہ تھیں۔ اس عمل (Process) میں قرآن حکیم کے جوہری پیغام میں تو کوئی تغیر نہیں واقع ہوتا، البتہ اس کی زیادہ بہتر طور پر تفہیم عمل میں آتی رہتی ہے۔(۸۰)

عرفان احمد خان قرآن حکیم کے پیہم و مسلسل اور لامتناہی و غیر محدود مطالعے کو ایک اور وجہ سے بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ خان صاحب کا یہ نظریہ دراصل ان پر مغربی فلسفی (Josiah Royce) (م ۱۸۵۵ء) کے افکار و خیالات کے اثرات کا نتیجہ ہے،(۸۱) روئس کا خیال ہے کہ انسانی عمل تفتیش و تحقیق (Inquiry) ایک لامتناہی و لامحدود (Infinite) اجتماعی اور نسلی و پشتینی (Generational) عمل (Process) ہے اور ایسا نوع انسانی کی متناہیت و محدودیت (Finitude) کے سبب سے ہے۔ روئس کے خیال میں تجربات کی اساس پر لامتناہی و لامحدود نتائج و حاصلات کی توثیق و تصدیق ایک غیر معین و غیر محدود (Indefinite) ملت کے وجود کی متقاضی ہے،(۸۲) چنانچہ خان صاحب کا خیال ہے کہ انفرادی اور اجتماعی قرآنی تفہیم کا عمل ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ عرفان احمد خان کے مذکورہ بیان کے دوسرے جزو، ''اس کے معانی و مطالب میں درک و بصیرت پیدا کرنے کی سعی و کوشش'' پر سطور بالا میں بحث کی جا چکی ہے۔

عرفان احمد خان کے بیان کا تیسرا حصہ قرآن حکیم کے لفظی محتویات سے راست ربط و تعلق کی استواری کا ہم سے تقاضا کرتا ہے۔ عمومی طور پر تعلق دو یا اس سے زیادہ افراد کے مابین استوار ہوتا ہے، روابط حرکی ہوتے ہیں اور کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ثابت و غیر متغیر متن سے ربط و تعلق استوار کیا جا سکتا ہے؟ خان صاحب کی رائے میں اس کا جواب اثبات میں ہے۔ خان صاحب کا یہ نقطہ نظر قرآن حکیم میں وارد لفظ ''الکتاب'' سے متعلق ان کے فہم و تدبر پر مبنی ہے۔ عرفان احمد خان کی رائے میں ''الکتاب'' کا جوہری پیغام توحید (خدا تعالیٰ کی وحدانیت) ہے۔ قرآن حکیم کے جوہری پیغام کے بارے میں یہ تصور مسلم فکری روایت میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

البتہ عرفان احمد خان کے نظریۂ تفہیم میں جونئی بات ہے وہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں ایک قاری جتنی بار بھی قرآن حکیم کی تلاوت کرتا ہے، تو گویا اس کی خدا سے ایک نئی ملاقات (ہم کلامی) ہوتی ہے، جیسے یہ کتاب لمحۂ موجود میں قاری کے لیے تازہ وحی کے طور پر نازل ہوئی ہو، (۸۳) قرآن حکیم کی تفہیم کا یہ نظریہ ہمیں ایک ایسے قرآن سے روشناس کراتا ہے کہ جس کے نزول کا سلسلہ پیہم جاری وساری ہے، اور جو ہمارے سامنے ایک معین ومختتم شے یعنی مصحف (ایک جلد بند کتاب) کی صورت میں نہیں ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ جہاں نوع انسانی اور خدا کے مابین ربط وتعلق قائم ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں جب بھی قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو یہ ان دونوں (انسان اور خدا تعالیٰ) کے مابین ہم کلامی کا عمل بن جاتا ہے۔(۸۴)

عرفان احمد خان کے بیان کا چوتھا جز وقرآن حکیم کے لفظی محتویات سے راست طور پر ربط و تعلق کی استواری ہے۔ ''راست تعلق'' سے ان کی مراد راست لمس (Direct touch) ہے۔ ان کی رائے میں اس راست لمس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، (۸۵) مثلاً راست لمس یہ ہے کہ ہم اپنی انگلیوں سے قرآن حکیم کے الفاظ کو چھوئیں یا ہماری آنکھیں الفاظ پر جم جائیں یا قرآن حکیم کی سماعت ہم سے اس امر کی متقاضی ہو کہ قرآن کو ہم اپنے سامنے کھول کر رکھ لیں۔ اس راست لمس کی غایت یہ ہے کہ ہم خدائی کلام پر اپنی توجہ مرکوز کرلیں تاکہ ہم قرآن حکیم کو اپنے قلب وذہن سے سمجھ سکیں، (۸۶) اس ضمن میں عرفان احمد خان'' حافظے اور قوت متخیلہ (Imagination) کے کردار کا انکار نہیں کرتے، البتہ حافظہ اور قوت متخیلہ تجرباتی بنیادوں (اصلی وحقیقی، طبعی وجسمانی روابط) کی محتاج ہوتی ہے جو مذکورہ تینوں ذرائع ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں''، (۸۷) (انجام کار راست لمس قرآن حکیم کے اصل عربی متن کی قرأت کا بھی تقاضا کرتا ہے، کیونکہ تراجم وتفاسیر ''فؤاد''، جو تفکر ووجدان کا طبعی حاسہ ہے، کی فعالیت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔(۸۸)

قرآن حکیم سے راست لمس کی اپنی صورت (Form) اور اپنا فعل (Function) ہوتا ہے۔ راست لمس کی سب سے اہم اور بنیادی صورت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت یا اس کی سماعت یہ تصور کرتے ہوئے کی جائے کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے راست طور پر کلام فرما رہا ہے، جو فؤاد سے بہرہ ور ہے، صاحب دل ہے یا صاحب تفکر وتدبر ہے اور پوری توجہ اور انہماک سے سن رہا ہے''، (۸۹)

راست لمس کی دوسری صورت قرآنی متن کا نظارہ ہے۔ نگاہ، ہمارے ملکۂ ادراک کا سب سے مستحکم اور قوی وسیلہ ہے، (۹۰) دید، سماعت سے بھی زیادہ مستحکم اور قوی وسیلہ ہے، تلاوت وقرأت کا عمل دراصل ہمارے ملکۂ سامعہ (حاسۂ سماعت) کے افزائش وترقی کی تحریک ہے، جس کا تعاقب ہمارے فؤاد (ملکۂ تفکر وتدبر) کو کرنا ہوتا ہے، بسا اوقات یہ تحریک اس درجہ سرعت سے انجام پاتی ہے کہ ہم اس کا ٹھیک طور پر ادراک نہیں کر پاتے۔ (۹۱) یہاں دید ہماری معاونت کرتی ہے جب کہ سماعت ''ایک غنائی صوت کا اتار چڑھاؤ (Flux)'' فراہم کرتی ہے۔ ہماری دید ایک ہی نظر میں آیات کے ایک مجموعے یا ایک چھوٹی مکمل سورت کا نظارہ کر لیتی ہے''، (۹۲) راست لمس کی تیسری صورت متن قرآن کو انگلیوں سے چھونا ہے۔ عرفان احمد خان کی نظر میں ''انگلیوں کا لمس ہماری آگے کو سفر وحرکت کرتی ہوئی نگاہ کی بایں طور مدد کرتی ہے کہ وہ قرآنی آیات کے اجزا کی بہتر طور پر تصویر کشی کر لیتی ہے، (۹۳) یہ عمل ہمیں استحکام سے ہمکنار کرتا ہے اور قلب کے لیے آیات کے ایک ایک لفظ یا جملے پر غور وفکر اور ان کے فہم کو آسان بنا دیتا ہے۔ (۹۴)

عرفان احمد خان کی نظر میں متعدد صورتوں میں راست لمس کا نقصان بھی واقع ہوتا ہے:

۱۔ بعض قارئین متن کو صرف دوسروں سے سن کر ہی سمجھتے ہیں (مثلاً مذہبی علما اور واعظین کے وعظ یا دیگر اہل علم وفضل کی تقاریر وخطبات کو سن کر) اس صورت میں ممکن ہے وہ '' قرآنی الفاظ کے حقیقی لمس کی سعادت سے مکمل طور پر محروم رہیں''، (۹۵) ۲۔ بعض لوگ '' قرآن حکیم سے متعلق کتب ومقالات کا مطالعہ تو کرتے ہیں جبکہ خود قرآن کا مطالعہ نہیں کرتے''، (۹۶) ۳۔ بعض دوسرے قرآن حکیم کی تفاسیر کا مطالعہ تو کرتے ہیں اور ان کی سعی وکوشش کا مطلق ہدف محض تفسیر قرآن کو سمجھنا ہوتا ہے، البتہ یہ خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے قرآن حکیم کو سمجھ لیا ہے، جبکہ حقیقتاً انھوں نے ایک ثانوی متن کے سوا کچھ سمجھا ہی نہیں ہوتا'' اور ۴۔ وہ لوگ جو ''اپنے جمے جمائے آرا، خیالات اور معتقدات کی تائید میں دلائل کی بازیافت کے لیے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں (تاکہ قرآن سے انھیں اپنے تصورات و خیالات کی تائید میں کوئی دلیل مل جائے)''، (۹۷) اس گروہ میں '' وہ ذہین لوگ بھی شامل ہیں جو تحقیقی مقالات کی تحریر وتسوید میں لگے ہوتے ہیں، یا محاضرات وخطبات دیتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے اظہارات (Presentations) کو مستند بنانے کے لیے قرآن حکیم سے دلائل کے متلاشی ہوتے ہیں''، (۹۸)

مختصر یہ کہ خان صاحب کے نزدیک قرآن حکیم کی ایک حرکی اور مستند تفہیم الہامی الفاظ (Divine Words) کے راست لمس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

عرفان احمد خان کی رائے میں ہر فرد کو اپنے ذہن وفکر کے ذریعے قرآن حکیم کو سمجھنا چاہیے۔ البتہ اس صورت میں ہر فرد کی تفہیم انفرادی موضوعیت (Individual Subjectivity) کی بنا پر لامحالہ طور پر کسی نہ کسی درجے میں (نسبتاً) دوسروں کی تفہیم سے مختلف ہوگی۔ حقیقت نفس الامری میں یہ اضافیت (Relativism) (کہ علم، حق، سچ، اضافی ہے اور زمان ومکان اور انفرادی تجربات پر منحصر ہے) ہی اس امر کی ایک وجہ ہے کہ ہم ایک ایسی تفہیمات کے طالب ہیں جو ہمیں متن قرآن کے حقیقی معانی ومطالب تک لے جائیں۔ عرفان احمد خان اس مسئلے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی فرد و بشر اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے قرآن حکیم کے حقیقی و مطلق معانی کو پالیا ہے،(۹۹) چنانچہ کسی فرد کی (انفرادی) تفہیم وتعبیر کے قبول کرنے پر دوسروں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ علم تفسیر کی روایت کی گزشتہ چودہ سوسالہ تاریخ کا ایک مسلمہ معمول بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین اپنی تفسیر کے اختتام پر یہ لکھتے رہے ہیں ''واللہ اعلم بالصواب'' (اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ حق وصواب کیا ہے) اس کا مطلب یہ ہوا کہ مفسر نے اپنے تئیں پوری کوشش کی کہ تعبیر وتفسیر بیان کرے لیکن بایں ہمہ وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کی تعبیر وتفسیر ہی صحیح ومستند اور اصلی و حقیقی تفسیر ہے۔ خان صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ انفرادی یا اجتماعی تعبیرات استناد چاہتی ہیں،(۱۰۰) جس کی برہان دلیل اساسی (Rationale) خود قرآن حکیم سے ملتی ہے جو ''اطمینان القلب'' کا تقاضا کرتا ہے۔ عرفان احمد خان کے ہاں تفہیم قرآن زندگی بھر کا طریق عمل (Process) ہے جو ایک طویل اور مسلسل ریاضت کا متقاضی ہے۔ اس عمل میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ ایک فرد کو اپنے فہم و تفکر قرآن پر اطمینان ہوجاتا ہے۔ مثلاً عرفان احمد خان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ (جن کا ذکر قرآنی آیت (البقرہ:۲۶۰) میں وارد ہوا ہے) وہ اطمینان القلب کے طالب تھے، اگرچہ وہ پہلے سے اللہ تعالی کی ذات پر ایمان رکھتے تھے،(۱۰۱) کسی بھی فرد کی قرآنی تفسیر و تعبیر کی امت کی طرف سے توثیق وتصدیق کی غرض سے عرفان احمد خان کا تجویز کردہ حل یہ ہے کہ ''اس امت کے علما وفضلا باہمی ارتباط وتعامل پیدا کریں، باہم دگر اپنی تفہیم وتعبیر کا تبادلہ کریں، ایک

دوسرے کی تفہیم و تعبیر سے سیکھیں اور ایک دوسرے کی تصحیح کریں"،(۱۰۲) یوں ایسے معانی و مطالب جن پر اجماع قائم ہو جائے وہی مستند معانی قرار پا سکتے ہیں۔ دیگر افراد بھی اس نوع کے اجماع سے، اپنی انفرادی تفہیم کا موازنہ کر کے مستفید ہو سکتے ہیں،(۱۰۳) تاہم اس نوع کے اجماعی معانی و مطالب بھی مطلقاً درست اور حقیقی دائمی و غیر متبدل معانی نہیں ہوتے بلکہ یہ معانی ہمیشہ تبدیلی و تغیر کے تابع رہتے ہیں اور نت نئی معلومات، ملکۂ ادراک کے ارتقا اور علمی پیش رفت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ استناد کا یہ عمل اور طریق کار (Process) توثیق و تصدیق اور استناد کے سلسلے میں سائنس دانوں کے اس منہاج کے بالکل مماثل ہے جو وہ متفق علیہ (اجماعی) معانی کے حصول (قبولِ عام) کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ اگر چہ ان میں سے ہر سائنس دان اپنے اپنے نظریات و تصورات (معتقدات) اور ادراکات و بصائر (Insights) کے مطابق کام کرتا ہے لیکن اپنے مطالعہ و تحقیقات کے مطالب و نتائج کی توثیق و تصدیق کے لیے وہ سائنسی برادری کی توثیق و تصدیق کا محتاج رہتا ہے۔(۱۰۴)

اختتامیہ: الحاصل یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرفان احمد خان اپنے مطالعۂ قرآن، تدبر و تفکر، فہم سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عصری مغربی فلسفیانہ اسلوب بیان کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآن حکیم کی تعبیر و تفہیم کے لیے ایک مربوط و متوازن (Integrated) نظریہ اور جامع منہاج تجویز کرتے ہیں۔ ان کا منہاج تفہیم قرآن ہر قاریِ قرآن سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کے لفظی محتویات سے ذاتی تعلق استوار کرے اور اپنے سماجی و تاریخی احوال و ظروف میں اپنے ذاتی غور و فکر سے اس کی تفہیم کی کوشش کرے۔ اس ضمن میں قاری متقدمین کی کتب تفاسیر اور دیگر ماخذ سے مدد لے سکتا ہے۔ البتہ ان ماخذ کو ایسے اساتذہ اور معلمین کا کردار ادا کرنا چاہیے کہ جو تفہیمِ قرآن میں ہماری بایں طور مدد کریں کہ خود ان کا اپنا فہم ہمارے لیے اساسی متون کا درجہ نہ حاصل کر لے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان اساتذہ سے سیکھیں اور عمل تفہیم کو آگے بڑھائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی تفہیم و تعبیر تک پہنچنے اور اس کی قبولیت کی ذمہ داری ایک شخصی و انفرادی عمل ہے۔ یہ کوئی یک وقتی اور جامد و غیر متحرک عمل نہیں بلکہ ایک دائمی و حرکی عمل کا نام ہے جو پیہم مطالعے، تفکر و تدبر، اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔

حواشی و تعلیقات

(۱) تعبیریات (ہرمانیوٹکس: Hermeneutics) کا تعلق متون کی تعبیر و تفہیم کے منہاجات سے ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: Hermeneutics، در The Stanford Encyclopedia of Philosophy، https://plato.stanford.edu/archives/win2016/entries/hermeneutics، اس موضوع پر اردو کتب کے لیے دیکھیے: گوپی چند نارنگ، ساختیات اور مشرقی شعریات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء) ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید: مغربی اور اردو تناظر میں (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۶ء)، اشاعت سوم، اصلاً انگریزی مقالے میں یہ دونوں کتابیں درج نہیں کی گئی ہیں۔ (۲) برنارڈ کے فریمون (Bernard K Freamon) کے الفاظ میں "قرآن حکیم کی کلاسیکی تعبیریات علما اور مفسرین کی کاوشوں کا حاصل و نتیجہ ہیں جنھوں نے اسلام کے ماخذ اساسی قرآن حکیم کے معانی و مطالب کے اکتشاف کو اپنے غور و تفکر کا موضوع بنایا اور اپنے تدبر و تفکر کے حاصلات و نتائج کو اس متن (قرآن حکیم) کی تفسیر کی صورت میں پیش کیا۔" دیکھیے: (فریمون Freamon: "Some Reflections on Post-Enlightenment Qur'anic Hermeneutics" در Michigan State Law Review، شمارہ: ۱۰: ۱۴۱۰ (۲۰۰۶ء)، ص ۱۴۰۳، مزید دیکھیے: تنویر عظمت: "Understanding and Qur'anic Revelation: The Dynamic Hermeneutic of Irfan A. Khan" (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، لوتھرن اسکول آف تھیالوجی، شکاگو ۲۰۱۶ء)، ضمیمہ ۶، ص ۱۷۴۔ http//:www.acdemia.edu/30411385/T.Azmat_QuranicHermeneutic_of_Irfan_A_Khan_TA_12-10-2016.pdf۔ (۳) یہ مقالہ میرے ڈاکٹریٹ کے محولہ بالا مقالے پر مبنی ہے۔ (۴) عرفان احمد خان: An Exercize in Understantding the Qur'an: An outline study of the last thirty divine discourses. (Surah:85, Surah 114) (شکاگو: ایسوسی ایشن آف قرآنک انڈر اسٹینڈنگ ۲۰۱۳ء)، ص ۱۔ (۵) تنویر عظمت "Understanding and Qur'anic Revelation"، ص ۴۔ (۶) ثانوی درسگاہ سے مراد مدرسہ ثانویہ (سیکنڈری اسکول) نہیں بلکہ یہ جماعتِ اسلامی رامپور (بھارت) کے زیر اہتمام قائم درسگاہ کا نام ہے۔ (۷) ثانوی درسگاہ (رامپور) کا قیام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تجویز پر ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا۔ اس درسگاہ میں سائنس اور علوم جدیدہ کے فارغ التحصیل طلبا کو علوم اسلامیہ کی تعلیم

دی جاتی تھی، دیکھیے: محمد نجات اللہ صدیقی (مرتب)، اسلام، معیشت اور ادب: خطوط کے آئینے میں (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۱۔ (۸) تنویر عظمت "Understanding and Qur'anic Revelation"، ضمیمہ ۱، ص ۱۶۱-۱۶۵۔ (۹) مولانا حمید الدین فراہی کے سوانح اور تالیفات کے لیے دیکھیے: https://www.hamid-uddin-farahi.org/ (۱۰) عبدالرب اثری فلاحی، ''مولانا جلیل احسن اصلاحی''، حیات نو (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۷-۴۱۔ (۱۱) حمید الدین فراہی، مجموعۂ تفاسیر فراہی، مترجمہ: امین احسن اصلاحی (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۹۔ (۱۲) مولانا اختر احسن اصلاحی، صدر مدرس، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ (اتر پردیش، بھارت)، ان کے سوانح اور آثار و تالیفات کے لیے دیکھیے: https://www.hamid-uddin-farahi.org.index.hp?option=com-contents&view=article&id=90&Itemad=78. (۱۳) مولانا امین احسن اصلاحی کے سوانح اور علمی آثار کے لیے دیکھیے: http://www.amin-ahsan-islahi.org (۱۴) فلاحی، ''جلیل احسن اصلاحی''، ص ۳۱-۳۳۔ (۱۵) ایضاً، ص ۲۳-۲۴۔ (۱۶) عرفان احمد خان، ''(خودنوشت) مختصر سوانحی خاکہ''، مملوکہ تنویر عظمت۔ (۱۷) یہ تاریخ عرفان احمد خان کی شکاگو یونیورسٹی میں تقرری کے سلسلے میں اسی یونیورسٹی کی طرف سے جو تقرر نامہ جاری کیا گیا اس پر مبنی ہے۔ (۱۸) خان، ''مختصر سوانحی خاکہ (خودنوشت)''۔ (۱۹) تجزیاتی فلسفہ ''تصوراتی تحلیل وتجزیے (Conceptual Analysis)'' سے بحث کرتا ہے، یہ پیچیدہ تصورات کی سادہ تصورات میں بایں طور کی تحلیل کرتا ہے کہ جن کا مزید تجزیہ ہو تحلیل نہ پیش کیا جاتا ہو یعنی اس کو اس حالت پر چھوڑ دیتی ہے کہ اس کا مزید تجزیہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ دیکھیے: A. P. Martinich "Introduction" مشمولہ A Companion to Analytic Philosophy (مرتبہ: A.P. Martinich و David Sosa)، مالڈن (Malden)، ایم اے (MA): بلیک ویل پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ص ۱-۲۔ (۲۰) عرفان احمد خان کی مطبوعہ تالیفات میں: ۱۔ Reflections on the Qur'an: Understanding Surahs al-Fatihah and al-Baqarah (لیسٹر شائر، یوکے: اسلامک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء) ۲۔ An Exercise in Understanding the Qur'an: An Outline Study of the last thirty Divine Discourses (Surah-85 Surah-114) ۳۔ عدد مطبوعہ مقالات اور مسجل (بصری) قرآنی محاضرات وخطبات (آڈیو ریکارڈنگ)، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات کے لیے دیکھیے: جمعیت تفہیم القرآن (ایسوسی ایشن آف قرآنک اَنڈر اِسٹینڈنگ) کی ویب سائٹ: https://quranicunderstanding.com/. (۲۱) عرفان احمد خان: "The Thing-

"Event Distinction"، مقالۂ ڈاکٹریٹ، شعبۂ فلسفہ، اِلینوئز یونیورسٹی (University of Illinois)، شکاگو، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۔(۲۲) ایضاً، ص ۱-۲، عرفان احمد کی خارجی دنیا عام آدمی کی دنیا ہے جو نہ صرف متخصصین بلکہ عامۃ الناس کو بھی دستیاب ہوتی ہے۔(۲۳) عرفان احمد خان کی خارجی دنیا میں تجریدی موجودات شامل نہیں ہیں (مثلاً ریاضیاتی اور اس نوع کے دیگر تصورات)۔(۲۴) ایضاً، ص ۱۹۔(۲۵) ایضاً۔(۲۶) ایضاً۔(۲۷) ایضاً، ص ۵، ۲۲، عرفان احمد خان، "Authenticity and Development of Islamic Thought"، در International Journal of Islamic and Arabic Studies، جلد ۴، عدد ۲ (۱۹۸۷ء)، ص ۱۸۔(۲۸) عرفان احمد خان: Reflection of the Qur'an، ص ۴۔(۲۹) عرفان احمد خان: "Thing-Event Distinction"، ص ۱۹۔(۳۰) RGDW، ایک ایسی اصطلاح ہے جو عرفان احمد خان نے قرآن حکیم (کی تفسیر و تعبیر) کے لیے وضع کی ہے۔(۳۱) عرفان احمد خان: Authenticity and Development of Islamic Thought، ص ۴۴۔(۳۲) ایضاً۔(۳۳) خان صاحب کے خیال میں آدم علیہ السلام اور حوا کا قصہ بار بار وقوع پذیر ہونے والا واقعہ ہے، جس کا ظہور ہر بچے کی ولادت کے موقع پر ہوتا ہے۔(۳۴) ایضاً، ص ۴۴؛ نیز دیکھیے: A.J.Droge (مترجم): The Qur'an: A New Annotated Translation، (برسٹل، سیٹی) CT Equinox Publishing Inc (۲۰۱۳ء)، ص ۱۷۱۔(۳۵) عرفان احمد خان: Authenticity and Development of Islamic Thought، ص ۴۴؛ مزید دیکھیے: القرآن، ۱۶: ۷۸، ۲۳: ۷۸، ۳۲: ۹، ۷۶: ۳۶، ۴۶: ۲۵، ۶۷: ۲۳۔(۳۶) عرفان احمد خان، Authenticity and Development of Islamic Thought، ص ۴۴؛ Droge (مترجم)، The Qur'an، ص ۲۷۲۔(۳۷) عرفان احمد خان، Exercise in Understanding the Qur'an، ص ۳۰؛ مثلاً حیاتیاتی اعتبار سے ایک کلب (کتا) بھی سمع، بصر اور فؤاد سے بہرہ ور ہوتا ہے، لیکن روحانی و معنوی اعتبار سے اسے مذہبی حقائق اور خیر و شر میں تمیز کے سلسلے میں یہ ملکات میسر نہیں ہوتے۔(۳۸) القرآن، ۷: ۱۷۲؛ ۹۱: ۷-۸۔(۳۹) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص ۸۔(۴۰) ایضاً۔(۴۱) عرفان احمد خان Authenticity and Development of Islamic Thought، ص ۴۴۔(۴۲) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص ۷، مزید دیکھیے: القرآن، ۲۰: ۵۰، ۸۷: ۱-۳۔(۴۳) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص ۷۔ (۴۴) ایضاً، نیز دیکھیے: القرآن، ۸۷: ۴-۵۔(۴۵) القرآن، ۵۵: ۲۹۔(۴۶) عرفان احمد خان، Authenticity

and Development of Islamic Thought، ص۴۰۔ (۴۷) ایضاً۔ (۴۸) ایضاً۔ (۴۹) ایضاً۔ (۵۰) ایضاً، ص۴۰۔۴۱۔ (۵۱) ایضاً، ص۴۰۔ (۵۲) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص۱۱، وہی مصنف، "Authenticity and Development of Islamic Thought"، ص۴۰۔ (۵۳) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص۲۹۔ (۵۴) عرفان احمد خان، Authenticity and Development of Islamic Thought، ص۴۱۔ (۵۵) ایضاً۔ (۵۶) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص۱۲۔ (۵۷) ایضاً، ص۸۔ (۵۸) ایضاً، ص۱۲۔ (۵۹) اس میں یہ بات مضمر ہے کہ جب ہم خارجی دنیا کے سب سے ٹھوس اور اٹل خصائص ومیّزات کی تفہیم کے ضمن میں تحدیدات (limitations) رکھتے ہیں (ایک حد تک) تو خارجی دنیا کے جو کمتر ٹھوس اور غیر اٹل کوائف کے ادراک میں ہماری مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں۔ (۶۰) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص۱۷۔۱۹۔ (۶۱) ایضاً، ص۱۷۔۲۳، ۲۶۔۲۹۔ (۶۲) ایضاً، ص۲۴۔ (۶۳) ایضاً، ص۲۶۔۲۹۔ (۶۴) عرفان احمد خان، Exercise in Understanding the Qur'an، ص viii۔ (۶۵) عرفان احمد خان، Thing-Event Distinction، ص۴۵۔ (۶۶) ایضاً، ص۴۵۔ (۶۷) عرفان احمد خان بہ نام نجات اللہ صدیقی، شکاگو، محررہ ۱۲/اگست ۱۹۷۸ء، مشمولہ اسلام، معیشت اور ادب: خطوط کے آئینے میں (مرتبہ: نجات اللہ صدیقی)، ص۲۶۵۔۲۶۹۔ (۶۸) ایضاً، ص۲۶۶۔ (۶۹) ایضاً۔ (۷۰) ایضاً، ص۲۶۶۔۲۶۷۔ (۷۱) ایضاً، ص۲۶۷۔ (۷۲) ایضاً، ص۲۶۴۔ (۷۳) القرآن، ۱۱:۲۶۔ (۷۴) عرفان احمد خان بہ نام نجات اللہ صدیقی، حوالۂ مذکورہ، (شکاگو، محرّرہ ۱۲/اگست ۱۹۷۸ء)، ص۲۶۷۔ (۷۵) ایضاً۔ (۷۶) ایضاً۔ (۷۷) عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an، ص۴۔ (۷۸) ایضاً۔ (۷۹) ایضاً۔ (۸۰) عرفان احمد خان بہ نام نجات اللہ صدیقی، حوالۂ مذکورہ، (شکاگو، محرّرہ ۱۲ اگست ۱۹۷۸ء)، حوالۂ مذکورہ، ص۲۶۸۔ (۸۱) عرفان احمد خان، "Authenticity and Development of Islamic Thought"، ص۳۴۔ (۸۲) عرفان احمد خان بہ نام نجات اللہ صدیقی، حوالۂ مذکورہ، (۱۲/اگست ۱۹۷۸ء) حوالۂ مذکورہ، ص۲۶۷۔ (۸۳) ایضاً۔ (۸۴) ایضاً۔ (۸۵) ایضاً، ص۲۶۹۔ (۸۶) اصول تفسیر (کا منہاج) مفسر کے لیے علوم القرآن (تفسیر، قرأت، اعجاز القرآن، اسباب النزول اور الناسخ والمنسوخ) سے گہری واقفیت کو لازم ٹھہراتا ہے۔ (۸۷) عرفان احمد خان اس طور پر اصول تفسیر کے منہاج کو غیر صحیح منہاج قرار نہیں دیتے البتہ وہ اس کے بعض پہلوؤں کو غیر معقول گردانتے ہیں (دیکھیے: عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an،

ص ۲۴-۳۲)۔(۸۸)ایضاً،ص ۳۳؛عرفان احمد خان، Authenticity and Development of Islamic "Thought"،ص ۴۴؛مزید دیکھیے: القرآن،۶:۱۔(۸۹)خان، Reflections on the Qur'an، ص ۱۰۔ (۹۰)خان صاحب کی تحریروں میں Royce کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تاہم جب اس مقالہ نگار نے ان کے اجتماعی (اجماعی) تصور تفہیم متن اور نظریہ تفہیمات کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے Royce کو اپنے تصورات ایک اہم ماخذ بتایا (قرار دیا)۔(۹۱)Griffin Trotter، On Royce: (شکاگو Wadsworth ۲۰۰۱ء)، ص ۷۷۔(۹۲)عرفان احمد خان جب خود قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں، تو وہ اس کی تلاوت بایں طور کرتے ہیں کہ گویا وہ پہلی بار اس کی تلاوت کر رہے ہوں اگرچہ انہوں نے ایک روز قبل ہی اس کی تفسیر بیان کی ہو۔ وہ ہر بار کی تلاوت کو تازہ وحی الٰہی اور کلام ربانی سے ہم کلامی (Encounter) کے مترادف گردانتے ہیں۔(۹۳)عرفان احمد خان، "Authenticity and Development of Islamic Thought"،ص ۳۵؛وہی مصنف، Exercise in Understanding the Qur'an ص ۲۔(۹۴)عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an،ص ۱۲-۱۴۔(۹۵)ایضاً،ص ۱۱۔(۹۶)ایضاً،ص ۱۳۔(۹۷)ایضاً،ص ۱۴۔(۹۸)ایضاً،ص ۱۳۔ (۹۹)ایضاً۔(۱۰۰)ایضاً۔(۱۰۱)ایضاً،ص ۱۴۔(۱۰۲)ایضاً۔(۱۰۳)ایضاً۔(۱۰۴)ایضاً،ص ۱۳۔عرفان احمد خان Exercise in Understanding the Qur'an،ص ۱۔عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an،ص ۳۳۔ایضاً ،ص ۱۰؛عرفان احمد خان، Authenticity and Development of Islamic Thought،ص ۳۵۔عرفان احمد خان، Exercise in Understanding the Qur'an،ص ۳۱-۳۲۔ عرفان احمد خان، Reflections on the Qur'an ص ۶۸۲۔عرفان احمد خان، Exercise in Understanding the Qur'an،ص ۳۵۔قرآن حکیم کے مطابق، ہر فرد اپنی تفسیر و تعبیر کا ذمہ دار ہے (القرآن، ۱۹:۹۵)۔اگر انفرادی اور اجماعی تفسیر میں اختلاف واقع ہو جائے تو ایک فرد کو ایک اخلاقی ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے اجماعی تعبیر و تفسیر کو قبول یا رد کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔خان صاحب کھلے لفظوں میں اس نکتے (نقطے) کا اظہار تو نہیں کرتے لیکن یہ ان کے تالیفی و تصنیفی سرمائے میں مضمر ہے۔عظمت Understanding and Qur'anic Revelation،ضمیمہ ۲،ص ۱۶۷،عرفان احمد خان، Authenticity and Development of Islamic Thought،ص ۳۶۔

اخبار الاخیار کا ایک ''خاتمۃ الکتاب''

ڈاکٹر عارف نوشاہی☆

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (محرم ۹۵۸-۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/۱۵۵۱-۱۶۴۲ء) کی فارسی تصنیف اخبار الاخیار فی اسرار الابرار کی تکمیل ۹۹۹ھ/۹۱-۱۵۹۰ء میں ہوئی۔ مصنف نے کتاب کے اختتام پر اپنے کسی دوست کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ درج کیا ہے، جس میں مادّہ ''ذکر الاولیا'' (۹۹۹) آیا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

طیب اللّٰہ حقّی انفاسک

زادك الله قوةً حسن [کذا: حسنةً]

نام و تاریخ این کتاب عزیز

گر کنی ''ذکر الاولیا'' احسن (۱)

تاریخ والا شعر اخبار الاخیار کے دہلی اور تہران ایڈیشن میں غلط طور پر ''گر کنی ذکر اولیا احسن'' نقل ہوا ہے۔ دہلی ایڈیشن میں ذکر اولیا کے اوپر لکیر کھینچ کر ۹۹۹ لکھا ہے (۲) اور تہران ایڈیشن کے مرتب ڈاکٹر علیم اشرف خان یہ مصرع اسی طرح درج کر کے تاکید کرتے ہیں کہ ''ذکر اولیا احسن'' قطعۂ [کذا: مادہ] تاریخ ہے اور اس سے ۹۹۹ برآمد ہوتا ہے۔ (۳) نہ تو دہلی ایڈیشن کے کاتب یا ناشر نے اور نہ ہی تہران ایڈیشن کے مرتّب نے مادّہ تاریخ کے عدد گننے کی زحمت کی۔ ''ذکر اولیا'' کے اعداد ۹۶۸ اور ''ذکر اولیا احسن'' کے اعداد ۱۰۸۷ بنتے ہیں، جو مطلوب نہیں ہیں۔ جب کہ ''ذکر الاولیا'' ۹۹۹ کے برابر ٹھیک بیٹھتا ہے۔

جنوبی ایشیا کے مشائخ اور علما کے حالات کے لیے اخبار الاخیار ایک مستند اور مروّج تذکرہ ہے

☆ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

اور اس بارے میں کچھ مزید کہنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ یہ تذکرہ متعدد بار ہندو پاکستان میں اور ایک بار ایران سے شائع ہو چکا ہے۔(۴) اس کے قلمی نسخے بھی عام ملتے ہیں۔(۵)

اخبار الاخیار شیخ محدث کی اولین تصنیف ہے۔ مختلف ادوار میں انھوں نے اس کے تین نسخے تیار کیے۔ خود اپنی ایک فہرست تصانیف میں لکھتے ہیں:

"نسخۂ اول بہ قدر پانزدہ ہزار بیت، ومتوسط دوازدہ ہزار بیت، ومنتخب آخر کہ قرار یافتۂ نُہ ہزار و کسری زائد، وثبت درین مجموعہ نسخۂ متوسط است واین اوّل تصنیفی است کہ رقم زدۂ کلک این مسکین شدہ است۔"(۶)

یعنی اس کا پہلا نسخہ تقریباً پندرہ ہزار سطور، متوسط نسخہ بارہ ہزار سطور اور آخری انتخاب کم و بیش نو ہزار سطور پر مشتمل تھا۔ اس مجموعے (فہرست تصانیف) میں نسخۂ متوسط کا ذکر ہوا ہے اور یہ اس مسکین کے قلم سے نکلنے والی پہلی تصنیف ہے۔

☆☆☆

حال ہی میں راقم السطور کو مکھڈ شریف، ضلع اٹک، پنجاب، پاکستان کے ایک خانقاہی کتب خانے متعلقہ مولانا محمد علی مکھڈی چشتی (۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰ء بٹالہ (امرتسر)۔۲۹ رمضان المبارک ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء مکھڈ) کے فارسی مخطوطات کی فہرست نویسی کرتے ہوئے شمارہ ۲۸۹ کے تحت اخبار الاخیار کا ایک نسخہ ہاتھ لگا جس کے اختتام پر مصنف کا ایک ایسا "خاتمۃ الکتاب" ہے جو دستیاب مطبوعہ ہندوستانی نسخوں میں نہیں ہے لیکن تہران ایڈیشن میں ناقص صورت میں موجود ہے۔ تہران ایڈیشن جن تین قلمی نسخوں کی بنیاد پر مرتب ہوا ہے ان میں سے یہ "خاتمۃ الکتاب" صرف سالار جنگ لائبریری اینڈ میوزیم، حیدرآباد، مکتوبہ ۱۰۸۰ھ (شمارہ T.S.494) میں آیا ہے۔ معلوم نہیں نسخۂ سالار جنگ میں یہ ناقص درج ہوا ہے یا تہران ایڈیشن کے مرتب سے کوئی فروگذاشت ہوئی ہے۔ تہران ایڈیشن میں نسخۂ دارالعلوم دیوبند بھی استعمال ہوا ہے جس کی تاریخ کتابت ۱۰۱۴ھ بتائی گئی ہے۔ اگر یہ تاریخ درست ہے تو دیوبند کا نسخہ مصنف کے حینِ حیات کتابت ہوا ہے۔

راقم السطور کو تجسس ہوا کہ دیکھا جائے یہ "خاتمۃ الکتاب" اور کن کن نسخوں میں درج ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کے لیے اخبار الاخیار کے سبھی نسخوں کا دیکھنا ضروری ہے جو ممکن نہیں ہے۔ البتہ تھوڑی

بہت جستجو سے اخبار الاخیار کے مزید چند نسخوں کے بارے میں یقین ہو گیا کہ ان میں یہ ''خاتمۃ الکتاب'' موجود ہے۔

تاحال اخبار الاخیار کے دریافت ہونے والے مخطوطات میں، ایک قدیم نسخہ، شعبان ۱۰۶۷ھ میں مصنف کے پڑپوتے سیف اللہ بن شیخ نور اللہ بن شیخ نور الحق دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو انھوں نے نسخۂ عصمت اللہ سے نقل کیا اور عصمت اللہ نے نسخۂ مصنف سے نقل کیا تھا۔ اس طرح اس نسخے کا شجرہ صرف ایک واسطے سے نسخۂ مصنف سے جا ملتا ہے۔ شیخ محدث کی اولاد و احفاد میں سیف اللہ نام ملتا ہے (۷) لہٰذا اس بارے میں کوئی ابہام نہیں کہ یہ مصنف کے خاندان کا نسخہ ہے۔ دوسرا نسخہ محمد علی نامی کاتب نے ۱۱۶۱ھ میں کتابت کیا۔ سرورق پر اسے ''منقول از نسخۂ مصنف'' بتایا گیا ہے، یہ دونوں نسخے، لاہور کے معروف عربی و فارسی محقق پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (۱۸۸۳-۱۹۶۳ء) کے ذاتی کتب خانے میں تھے۔ (۸) اب یہ کتب خانہ اُجڑ چکا ہے اور نسخے بکھر گئے ہیں، پہلے نسخے کے بارے میں تاحال معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں گیا، دوسرا نسخہ مکتوبہ ۱۱۶۱ھ اب قومی کتب خانہ پاکستان، اسلام آباد میں آچکا ہے۔ وہاں اس کا شمارہ ۲۸ ہے۔ اس کا مکمل ترقیمہ اس طرح ہے:

> ''قد تمّت الکتاب المسمی باخبار الاخیار بعون الملک الوہاب فی التاریخ تسعہ یوم خمیس فی شہر شوال المکرم ۱۱۶۱ سنہ احدی وستین ومایہ والف ہجریہ نبویہ مقدسہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، در بلدۂ خجستہ بنیاد (نام ندارد) کاتب الحروف، ذاکر خفی وجلی، محمد علی، خاک و مرید آستانۂ حضرت شاہ سلطان فرزند و خلیفۂ حضرت شاہ تاج قادر قمیص قدس اللہ سرہ العزیز ہم، بصورت اتمام یافت۔''

قومی کتب خانہ پاکستان میں شمارہ ۲۶۵ اور ۲۹۵ کے تحت اخبار الاخیار کے دو اور نسخے بھی ہیں، (۹) نسخۂ شمارہ ۲۶۵ کے دو ترقیمے ہیں۔ پہلے ترقیمے میں کاتب کا نام محمد صادق ساکن قصبہ میرٹھ، شوال سنہ ۱۷ محمد شاہی (۱۱۴۷ھ) برائے پاس خاطر خان رفیع الشان سید محمد قبول محمد خان لکھا ہے دوسرے ترقیمے میں ''تحریر فی التاریخ چہارم شہر شوال سنہ ۱۷ در گلشن آباد موضع (تند ہرہ؟ نام پڑھا نہیں جا سکا) قلمی شد'' لکھا ہے۔ ظہر یہ پر اس کی تاریخ خرید'' دوازدہم شہر ذی قعدہ ۱۱۸۴ھ'' درج ہے۔ خریدار کا نام اور چند مہریں مٹا دی گئی ہیں۔ شمارہ ۲۹۵ کے تحت نسخہ بلا تاریخ ہے۔ ہم نے یہ نسخے دیکھے

ہیں، ان دونوں نسخوں میں بھی ''خاتمہ الکتاب'' موجود ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی (۱۹۲۵-۱۹۹۷ء) کے جدامجد مولوی ارشاد علی مرحوم نے اخبار الاخیار کا ایک نسخہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو ملتان میں نقل کرایا تھا جس کی تصحیح حکیم محمد حسن امروہی نے کی تھی۔ اس میں بھی یہ ''خاتمۃ الکتاب''/تتمہ موجود ہے۔ پروفیسر نظامی نے اسے بعینہٖ نقل کیا ہے۔(۱۰)

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کرآئے ہیں شیخ محدّث نے اخبار الاخیار کے تین نسخے تیار کیے تھے۔ راقم السطور نے اس سے پہلے اخبار الاخبار کے نسخوں کو کبھی اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔ نہ ہی ہندوستانی اور ایرانی اشاعت میں اس بات کا اظہار ہوا ہے کہ یہ نسخہ ہائے اول، متوسط یا منتخب میں سے کون سا ہے؟ پروفیسر نظامی نے اخبار الاخیار کے نسخوں میں عبارتوں کے اختلاف کی ضرورت بات کی ہے۔(۱۱) لیکن یہ اختلاف معمول کا ہوسکتا ہے جو ہر کتاب کے نسخوں میں ہوتا ہے۔

اس ''خاتمۃ الکتاب'' کی روشنی میں ہم اخبار الاخیار کے نسخوں کی درجہ بندی اس طرح کر سکتے ہیں کہ دو نسخے شیخ محدّث نے ۹۹۶ھ میں حجاز جانے سے بہت پہلے تیار کیے تھے اور تیسرا نسخہ حجاز سے واپسی (۹۹۹ھ) کے بعد تیار کیا۔ حجاز جانے سے پہلے کے نسخے مفصل اور طویل تھے اور سفر حجاز سے واپس آنے کے بعد جو نسخہ تیار ہوا وہ تنقیح شدہ اور منتخب تھا۔ یہاں ایک اشکال یا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض نسخوں کے آخر میں ایک ملمع قطعۂ تاریخ تصنیف ''قال بعض اصحابنا فی تاریخ ھذا الکتاب'' درج ہے جس سے اخبار الاخیار کا سال تکمیل ۹۹۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ اول، متوسط یا منتخب میں سے کس نسخے کی تاریخ تصنیف ہے؟ کیوں کہ شیخ محدث ''خاتمۃ الکتاب'' میں لکھتے ہیں کہ سفر حجاز سے واپسی (۹۹۹ھ) کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے اور فی الفور اخبار الاخیار پر نظر ثانی کا وقت نہ مل سکا۔ شیخ کے لب و لہجے سے لگتا ہے کہ نظر ثانی کا کام حجاز سے واپسی کے کئی سال بعد اس وقت ہوا جب معاصرین کی طرف سے اس کتاب پر اعتراضات وارد ہونے لگے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخبار الاخیار کے جن قلمی نسخوں کے ساتھ یہ ''خاتمۃ الکتاب'' موجود ہے وہ نظر ثانی شدہ اور منتخب نسخہ ہے؟ اس کا باوثوق جواب اخبار الاخیار کے متعدد مخطوطات یکجا کرکے اور ان کا باہمی تقابل کرکے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مصنف کی درجہ بندی (اول، متوسط، منتخب) کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام دستیاب نسخوں

کی درجہ بندی کرنا ہوگا۔ اگرچہ احتمال ہے کہ ''نسخۂ منتخب'' ہی متداول ہوا ہے۔ چونکہ مطبوعہ نسخوں میں ان مباحث کا جواب نہیں ملتا، یہ اخبارالاخیار کے ایک نئے تنقیدی۔تحقیقی ایڈیشن کا تقاضا کرتے ہیں، اگر مولوی محمد شفیع کے کتب خانے کا نسخہ مکتوبہ ۱۰۶۷ھ بازیاب ہوجائے تو نئے تنقیدی ایڈیشن کی تیاری میں اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

☆☆☆

مکھڈ شریف کا نسخۂ اخبارالاخیار، بلا تاریخ ہے۔لیکن میں اسے گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کی کتابت سمجھتا ہوں، نسخہ اگرچہ خوش خط نستعلیق میں ہے اور صاف پڑھا جاتا ہے لیکن کاتب کم سواد ہے اور لگتا ہے جن الفاظ کے وہ معانی نہیں جانتا تھا یا اس کے لیے مشکل تھے، ان کی محض شکلیں بنادی ہیں۔ اسی لیے اس کاتب سے بہت سہو ہوئے ہیں۔ نسخے پر دو مُہریں ثبت ہیں۔ ایک میں ''رفیع الدین'' کندہ ہے، دوسری اتنی مدھم ہے کہ پڑھی نہیں جاتی۔ یہ نسخہ ۳۰۸ ورق پر مشتمل ہے اس میں ''خاتمۃ الکتاب'' ورق ۳۰۷/الف تا ۳۰۸/الف نقل ہوا ہے۔

مجھے مناسب معلوم ہوا یہ ''خاتمۃ الکتاب'' یہاں درج کر کے کچھ نتائج اخذ کیے جائیں، اگرچہ پروفیسر نظامی نے اپنے جدامجد کے نسخہ سے یہ فارسی عبارت نقل کی ہے لیکن اولاً اس پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا اور صرف یہ کہا ہے کہ اس عبارت سے اخبارالاخیار کی تصنیف و ترتیب کے ماحول پر روشنی پڑتی ہے، ثانیاً منقولہ عبارت میں کچھ تسامحات بھی ہیں۔ تہران ایڈیشن کی عبارت بالکل ناقص ہے۔ نسخۂ نظامی، نسخۂ مکھڈ اور تہران ایڈیشن کو سامنے رکھ کر کوشش کی گئی ہے کہ ''خاتمۃ الکتاب'' کا ایک صاف متن پیش کیا جائے جو مضمون ہذا کے آخر میں درج ہے۔ وہاں نسخوں کے اختلافات بھی بتائے گئے ہیں۔

''خاتمۃ الکتاب'' لکھنے کی تاریخ واضح نہیں ہے۔ مکمل ہونے کے باوجود نسخۂ مکھڈ میں قطعۂ تاریخ تصنیف درج نہیں ہوا۔ اگر ۹۹۹ھ کو اخبارالاخیار کی آخری تسوید کا سال مان لیا جائے تو اس ''خاتمۃ الکتاب'' میں جب شیخ محدّث یہ کہتے ہیں کہ'' آج سے تیس سے بیشتر اور چالیس سے کم تر، سال پہلے کی بات ہے'' تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیخ اپنی دس پندرہ سال عمر (حدود ۹۶۹-۹۷۴ھ) کی بات کر رہے ہیں۔ باقی انہی کے زبانی سنیے (ملخص ترجمانی از راقم السطور):

میں ایک دن درویشوں کی صحبت میں بیٹھا تھا۔ درویش اپنے پیروں کی باتیں کچھ اس ذوق

اور حلاوت سے کر رہے تھے کہ میرے دل میں گھر کر گئیں۔ ہر وقت وہی باتیں دل میں، زبان پر اور قلم پر جاری رہتی تھیں، چنانچہ میں نے وہ سب کچھ قلم بند کر لیا اور مزید حالات بھی طلب کیے۔ اب لگنے لگا یہ تو ایک کتاب بنتی جا رہی ہے۔ متقدمین مشائخ کے حالات چونکہ ان کے مقامات سے پہلے لکھے جا چکے تھے، اب ان کے مقامات کی بھی طلب ہوئی، چنانچہ مقامات ملنے پر، یہ تازہ مواد، جو کچھ پہلے لکھا جا چکا تھا، اس کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ اب یہ ایک پسندیدہ، جامع اور مفید کتاب بن چکی تھی۔ یہ ابتدائے عشق تھا اور ان باتوں کا شوق تازہ تازہ تھا۔ ایسی باتیں سننے اور انھیں جمع کرنے کی خواہش بے اندازہ تھی۔ یہ (اخبار الاخیار) پہلی کتاب تھی جو میں نے لکھی۔ لیکن مضامین میں کچھ بے ترتیبی تھی اور جیسا چاہیے تھا اس طرح تنقیح اور تلخیص نہ ہو سکی۔ دو تین نسخے اسی اضطرابی کیفیت میں لکھ کر شائع کر دیے، کچھ مقصود یہ بھی تھا کہ دیکھنے والے اظہار نظر کریں (کہ یہ کام کیسا ہے؟)۔ اسی دوران ۹۹۶ھ میں حجاز کا سفر درپیش ہوا۔ جب اس سفر سے واپسی ہوئی تو ہمت دوسرے کاموں کی طرف متوجہ رہی اور اس کتاب (اخبار الاخیار) کو دیکھنے کی فرصت نہ مل سکی، اچانک دیکھا کہ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ کتاب تو بہت طویل اور پُر گوئی پر مشتمل ہے اور اس کی طوالت سے طبیعت کو ملال ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کتاب کے رجال پر جرح و تعدیل شروع کر دی اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض اس دیار (ہندوستان) کے ابنائے روزگار اور استاد لوگ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ جب یہ متقدمین اس عالم سے رخصت ہو گئے تو ارباب غرض و ہوا کا ان کے ساتھ حسد اور رشک کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا اور وہ لوگوں کی گزندِ زبان سے نجات پا کر دائرۂ اجماع و اتفاق میں آ کر آسودہ ہو گئے، رہا معاملہ متأخر مشائخ کا، چونکہ اقرار و انکار کے اپنے اپنے اسباب ہوتے ہیں، ان کے (مقام و مرتبے کے) بارے میں نزاع و خلاف پیدا ہو گیا اور ان کا انکار اور عیب جوئی کی گئی۔ لیکن فضلِ تقدّم تو بہر حال باقی ہے۔ معترضین یہ نہیں جانتے کہ متقدمین بھی اپنے زمانے میں متأخرین رہے ہیں اور بعضی اہل زمانہ ان کے کمالات سے بھی غافل اور بے خبر تھے۔ اور یہی متأخرین کچھ زمانہ گذرنے کے بعد متقدمین میں شمار ہونے لگیں گے۔ لہٰذا ہمیں تقدّم و تأخّر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ انصاف سے کام لینا چاہیے اور حسن عمل مدنظر رہنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اس کتاب کا نام ''اخبار الاخیار'' (نیک لوگوں کی باتیں) ہے، ''تذکرۃ الاولیا'' (اولیا کا تذکرہ) یا ''سیر العارفین'' (عارفوں کی سیرتیں) نہیں ہے۔ جن

لوگوں (کے مقام و مرتبہ) سے انکار کیا گیا ہے، ان کا ذکر اس کتاب میں طفیلی اور ضمنی ہے۔ اصل میں ان کا ذکر مقصود نہیں ہے۔ یہ بات کتاب کے دیباچے میں بھی لکھی جا چکی ہے، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود وقت اور دوستوں کے تقاضے کے مطابق اس کتاب پر نظر ثانی ضروری سمجھی اور بعض مضامین کو مختصر اور تنقیح کیا ہے۔ اگر قارئین چاہیں تو پرانے نسخوں سے (ملا کر) تبدیل کر لیں۔ اس کے باوجود اگر ستم ظریفوں کے دل میں کھٹکا ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ جس قدر ممکن تھا کر دیا گیا، اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے۔ لہذا مجھے معاف رکھا جائے۔ ویسے بھی بے عیب تو خدا کی ذات ہے اور وہی بندوں کے عیب بھی ڈھانپتا ہے۔

☆☆☆

خاتمۃ الکتاب اخبار الاخیار

(بہ قلم شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

''این سطری چند است کہ در بیان (۱) باعثۂ اختصار کتاب، رقم زدۂ کلک مؤلف گشتہ۔ بمنّہ و فضلہ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت عندہ ام الکتاب۔

کاتب حروف۔ ختم اللہ لہ بالحسنی (۲) و جعل آخرتہ خیرًا من الاولی۔ پیش از این تاریخ (۳) از سی (۴) سال بیشتر (۵) و از (۶) چہل سال کمتر، روزی در خدمت درویشان، بہ ذوق صحبت (۷) ایشان نشستہ بود۔ چنان کہ رسم مریدان باشد، از مناقب پیران (۸) سخن می کردند بہ خاصیت ذوق (۹) و حلاوتی کہ سخنان این طایفہ دارد (۱۰) چنان آن حکایات در دل جای کرد و در گرفت (۱۱) کہ چون از آن مجلس برخاست، ہمہ آن شدہ بود۔ (۱۲) اگر فکری کرد (۱۳) ہمان در خیال می آمد و اگر سخن می گفت ہمان بر زبان می رسید و اگر خامہ می زد ہمان می تراوید (۱۴)، پس بہ شوق تمام آن را بنوشت و طلب مزید کرد۔ تا رفتہ رفتہ قدری محسوس پیدا آمد و چون ثبت (۱۵) احوال پیشینیان پیش از ذکر مقامات پیشینیان (۱۶) اتفاق افتاد، طلب آن نیز کرد و از ادنیٰ بہ اعلیٰ رفت (۱۷) و بہ آن نبشتہ (۱۸) ضم کرد و کتاب را بہ این مزین و مجلّا (۱۹) ساخت تا مجموعہ ای (۲۰) بہ ہم رسید نیکو و پسندیدہ و جامع و مفید لیکن چون اوّل عشق بازی و شوق این سخنان تازہ بود و حرص استماع و (۲۱) اجتماع آن بی اندازہ۔ و (۲۲) اوّل کتابی بود کہ خامہ کاتب حروف بہ تسوید آن جریان (تجربہ) یافتہ، صورت ترتیب (۲۳) سخن بی اضطرابی

نیامد(۲۴) وچنان کہ باید تنقیحی وانتخابی نیافت(۲۵) وہم بہ حکم اضطراب باضمیمۂ اقتراح (۲۶) بعضی (۲۷) دوسہ نسخہ ہم برآن نمط نوشتہ شدہ، انتشار(۲۸) یافت۔

درین اثنا، درسنہ ست وتسعین وتسعمائۃ (۹۹۶) بہ سفرحجاز رفت، چون ازین سفر بازآمد، حالی گردیدہ وہمت بہ جانب دیگر مصروف گشتہ بود۔ فرصت نظر درآن (۲۹) کتاب نیافت۔ ناگاہ مردم را دید بہ راہ اختلاف وانتقاد(۳۰) رفتہ، بعضی آن را بہ تطویل واطناب موسوم داشتہ ونظر ملالت وسامت بروی گماشتہ وبعضی درجرح وتعدیل آن افتادہ(۳۱) وزبان طعن وتشنیع (۳۲) کشادہ۔ بہ علت آن کہ بعضی ازین ہا، اہل زمان وابنای روزگار واستادروزگار این دیار بودہ اند(۳۳) وحقیقت آنکہ چون پیشینیان (۳۴) ازعالم گذشتہ وعلاقہ حسد وغبطہ(۳۵) ارباب غرض وہواازایشان گسستہ، (۳۶) واز زبان مردم رَستہ، دردائرۂ اجماع (۳۷) واتفاق آسودہ اند، اماپسینیان (۳۸) ازاہل زمان چون بواعث ودواعی اقرار وانکار درمیان است، درکشاکشِ نزاع وخلاف افتادہ، دست(۳۹) آلودۂ قدح وانکار گشتند۔ ونعم فضل ومزیّت (۴۰) تقدم باقی است، امااین قدر دانند کہ آن (۴۱) متقدمان (۴۲) نیز (۴۳) در وقت خود متأخر بودند وبعضی از اہل زمان از کمالات ایشان غافل ومحجوب، واین (۴۴) متأخرین بعدازان خود متقدم شوند، نظر بر تقدم وتأخر(۴۵) نباید گذاشت (۴۶)۔ انصاف باقی است و حسن عمل منظور۔

ونیز نام این رسالہ ''اخبارالاخیار'' است، نہ ''تذکرۃ الاولیا'' و''سیر العارفین'' مثلاً۔ وذکرآنہا کہ آشناند ومحل تردّد وانکار گشتہ، (۴۷) بہ طفیل است نہ بہ قصد؛ بہ تبعیّت است نہ بہ اصالت۔ (۴۸) این سخن دردیباچہ گفتہ شدہ است، (۴۹) حاجت تکرار (۵۰) نیست۔ وباوجود(۵۱) آن، بہ صلاحدید وقت ویاران (۵۲) امرار(۵۳) نظر ثانی برآن لازم افتاد(۵۴) وبرخی ازاختصار وتنقیح نمود(۵۵) تااگر بخواہند(۵۶) آن نسخہ ہای کہنہ رابہ این نوشتہ بازآرند۔ (۵۷) واگرہنوز از دغدغۂ ستم ظریفان (۵۸) باقیست، چارہ نیست۔ این قدر کردہ شد، زیادہ برین مقدور نبود، معذور دارند۔ بی عیب خداست، عیب پوش بندگان (۵۹) اوست۔ وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔ (۶۰) وتمّت کلمۃ ربك صدقا وعدلا لامبدل کلماتہ وھو السمیع العلیم۔''

حواشی

(۱) اخبار الاخیار، مخطوطہ راشد آفندی لائبریری، قیصری، ترکی، شمارہ ۹۲۷، بلا تاریخ، ورق ۲۳۷ الف، متداول نسخوں میں مصرع ثانی میں ''زادك الله قوةً و غِنًی'' ہے اور یہ زیادہ موزوں ہے۔ نیز خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، دہلی، ندوۃ المصنّفین، ص ۲۰۳۔ (۲) دہلی، مطبع مجتبائی، ۱۳۳۲ھ، بہ اہتمام حافظ محمد عبدالاحد، ص ۳۲۳۔ (۳) تہران، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ۱۳۸۳شمسی/ ۲۰۰۵ء، تصحیح و توضیح علیم اشرف خان، مقدمہ ص ۳۶، متن ص ۶۴۶، حاشیہ ص ۶۴۶، ہمارے دوست ڈاکٹر علیم اشرف خان صاحب تاریخیں لکھنے میں کافی سہل پسند واقع ہوئے ہیں۔ شیخ محدث سے متعلق کئی تاریخوں کو آگے پیچھے کر دیا ہے۔ وہ شیخ محدث کی تاریخ ولادت ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۱ء اور تاریخ وفات ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۵۴ء لکھتے ہیں (مقدمہ، ص ۲۲، ۲۳)، جب کہ شیخ کی تاریخ ولادت محرم ۹۵۸ھ اور وفات ۲۲ ربیع الاوّل ۱۰۵۲ھ ہونے میں کسی کو ابہام نہیں ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دونوں ہجری تاریخوں کی عیسوی تاریخ سے مطابقت بھی درست نہیں ہے۔ ۹۵۷ مطابق ۱۵۵۰ء ہے اور ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵ مطابق ۱۶۴۴۔ ۱۶۴۵ء ہے۔ شیخ محدث ۹۹۶ھ میں حجاز گئے تھے (خلیق احمد نظامی، ص ۹۸۔ ۹۹)، ڈاکٹر علیم نے یہ سال ۹۹۵ھ۔ ۹۹۶ھ لکھا ہے (مقدمہ، ص ۲۲)۔ (۴) عارف نوشاہی، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، تہران، میراث مکتوب، ۱۳۹۱شمسی/ ۲۰۱۲ء، ج ۱، ص ۶۹۹۔ ۷۰۰، آٹھ طباعتوں کا ذکر ہوا ہے۔ قدیم ترین ۱۲۷۰ھ، دہلی، مطبع احمدی، بہ اہتمام شیخ ظفر علی ہے۔ تہران ایڈیشن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ (۵) احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۹۰ء، ج ۱۱، ص ۸۵۹۔ ۸۶۳، پینتیس نسخوں کی نشان دہی کی ہے۔ عارف نوشاہی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، تہران، میراث مکتوب، ۱۳۹۶شمسی/ ۲۰۱۷ء، ج ۲، ص ۹۰۱، مزید چار نسخوں کی نشان دہی ہوئی ہے۔ اس طرح اب تک پاکستان میں کل انتالیس نسخے دریافت ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں اخبار الاخیار کے اس سے کہیں زیادہ مخطوطات ہوں گے، لیکن ہندوستانی مخطوطات کی کوئی جامع فہرست دستیاب نہیں ہے۔ سید محمود حسن قیصر رضوی نے مرآۃ التصوف، علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۵ اور ڈاکٹر امجد علی نے

فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۹ء، ص ۱۶-۱۷ میں صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں اخبار الاخیار کے ۸ نسخوں کی نشان دہی کی ہے۔ رضا رامپور لائبریری میں ۳ نسخے ہیں۔ ڈاکٹر علیم اشرف خان نے ۳ ہندوستانی نسخے استعمال کیے وہ ان کے علاوہ ہیں (اخبار الاخیار، مقدمہ ۴۱-۴۲)۔ ترکی میں دو نسخوں کی موجودگی کا علم ہوا ہے، ایک کا پہلے حوالہ آچکا ہے جو راقم السطور نے خود دیکھا تھا (حاشیہ ۱) دوسرا سلیمانیہ لائبریری، استنبول، ذخیرۂ اسعد افندی، شمارہ ۱۳۱۱، انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ یہ بہت متأخر نسخہ ہے۔ اسے محمد صالح بن محمد صنع اللہ ارزنجانی نقشبندی نے غرّہ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ کو قسطنطنیہ میں بخط نسخ کتابت کیا اور حاشیے پر تاکیداً لکھا ہے کہ اصل سے مقابلہ کیا گیا ہے، اس نسخے میں خاتمۃ الکتاب نہیں ہے۔ ایران میں ۸ نسخے یا ان کی مائیکروفلمیں موجود ہیں، کتب خانہ آیت اللہ مرعشی، قم، شمارہ ۹۵۶۴ کی تاریخ رمضان ۱۱۳۷ھ ہے (مصطفی درایتی، فہرستوارۂ دست نوشت ہای ایران، تہران، کتاب خانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، ۱۳۸۹ شمسی، ج ۱، ص ۴۱۰)۔ یورپ کے نسخے یورپ کی فہرستوں میں مذکور ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ دنیا بھر میں اخبار الاخیار کے نسخے پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہوکر ہی اخبار الاخیار کا تنقیدی متن پیش کیا جاسکتا ہے۔ (۶) تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف، بحوالہ: خلیق احمد نظامی، ص ۲۰۲-۲۰۳۔ (۷) ایضاً، ص ۲۴۶، ۲۵۲۔ (۸) بشیر حسین، محمد، فہرست مخطوطات شفیع، لاہور، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۲-۱۰۴۔ (۹) http://www.nlp.gov. pk/manualscript.html انٹرنیٹ پر دستیاب فہرست مخطوطات نیشنل لائبریری آف پاکستان، اسلام آباد میں تینوں نسخوں کا ذکر ہوا ہے۔ (۱۰) خلیق احمد نظامی، ص ۲۰۱-۲۰۲۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۰۳۔

خاتمۃ الکتاب اخبار الاخیار کے اختلافات نُسخ

(۱) علیم: این سطری چند است کہ در بیان، ندارد۔ (۲) مکھڈ: ختم اللہ بالخیر۔ (۳) نظامی: پیش از تاریخ۔ (۴) مکھڈ: سی ندارد۔ (۵) علیم: پیشتر۔ (۶) نظامی: واز، ندارد۔ (۷) مکھڈ: ذوق صحبت؛ علیم: ذوق وصحبت۔ (۸) نظامی؛ علیم: پیران خود۔ (۹) نظامی: ذوق ندارد۔ (۱۰) علیم: این طایفہ راست۔ (۱۱) نظامی: در دل جای کرد دا (کذا) گرفت، مکھڈ: در دل جای کرد کہ (کذا) و در گرفت، متن مطابق علیم است۔ (۱۲) نظامی: برآن شدہ بود؛ علیم: ہم

برین شدہ بود۔(۱۳)علیم: می کردند۔(۱۴)نظامی میں یہ عبارت مختصر ہے یا قلم انداز ہوگئی ہے اور اس طرح درج ہوئی ہے: اگر فکری می کرد ہمان می تراوید۔(۱۵)علیم میں اس کے بعد عبارت کی قلم انداز ہوگئی ہے اور مختصراً یوں ہے: چون ثبت ودر دیباچۂ کتاب گفتہ شدہ است۔(۱۶)نظامی: پیشینان۔(۱۷)مکھڈ: از ادنیٰ بالا رفت۔(۱۸)نظامی: پیشینہ، مکھڈ: نشستہ۔(۱۹) نظامی: مجلّی ۔(۲۰)مکھڈ: مدعہ (کذا)۔(۲۱)مکھڈ: و ندارد۔(۲۲)نظامی: در۔ (۲۳)مکھڈ: تربیت۔(۲۴)نظامی: نباید۔(۲۵)نظامی: بتافت۔(۲۶)نظامی: یا ضمیمۂ افراح؛ مکھڈ: افتراح، تصحیح قیاسی۔(۲۷)نظامی: بعضی از اصحاب۔(۲۸)نظامی: اعتبار۔(۲۹)نظامی: برآن۔(۳۰)نظامی: انتقاذ۔ (۳۱)نظامی میں جملے کی ترتیب بدلی ہوئی ہے: بعضی در جرح وتعدیل آن افتادہ ونظر ملالت وسامت بروی گماشتہ۔ (۳۲)نظامی: زبان تشنیع۔(۳۳)نظامی: استاد وساکنان این دیار بودہ اند۔(۳۴)نظامی: پیشینان۔(۳۵)نظامی: حسد وعناد۔(۳۶)مکھڈ: گشتہ۔(۳۷)مکھڈ: اجتماع۔(۳۸)مکھڈ: پیشینیان۔(۳۹)نظامی: افتادہ است۔ (۴۰)نظامی: مرتبہ۔(۴۱)نظامی: این۔(۴۲)نظامی: مقدمانِ، مکھڈ: مقتدیان، تصحیح قیاسی۔(۴۳)نظامی: دین۔(۴۴)نظامی: این، ندارد۔(۴۵)نظامی: تاخر و تقدم۔(۴۶) نظامی: نباید کرد۔(۴۷) مکھڈ: گشتہ، ندارد۔(۴۸)مکھڈ: بہ طفیل وتبعیت نہ بہ قصد واصالت۔(۴۹) نظامی: گفتہ شد۔(۵۰)نظامی؛ علیم: بہ تکرار۔ (۵۱)مکھڈ: بوجود۔(۵۲)مکھڈ: وقت یاران۔(۵۳)نظامی: اصرار۔(۵۴)علیم: صلاحدید وقت وخاطر یاران ازنظر ثانی بہ آن؛ اس کے بعد تین نقطے لگائے ہیں اور برآن لازم افتاد چھوٹ گیا ہے۔(۵۵)نظامی: برخی از اختصار او نمودہ؛ علیم: برخی از اختصار سوی (کذا) تنقیح روی نمود۔(۵۶)مکھڈ، بخوانند، نظامی، علیم: خواہند۔(۵۷)نظامی: آن سخن ہای نوشتہ باز آرند؛ علیم: آن نسخۂ کہنہ نوشتہ را بہ آن نونوشتہ باز آرند۔(۵۸)نظامی: شتم طریقی؟ علیم: ستم ظریفی۔(۵۹)نظامی؛ علیم: بندگان، ندارد۔(۶۰)نظامی میں دعائیہ عبارت مختصر ہے: صلی اللہ علیہ وسلم و تمت کلمۃ ربك صدقا و عدلا لا مبدل کلماتہ وھو السمیع العلیم؛ علیم: صلی اللہ علی محمد و آلہ وسلم ......اس کے بعد وہی عبارت ہے۔

مالک رام کے خطوط بنام شمس بدایونی

ڈاکٹر شمس بدایونی

مالک رام (۱۹۰۶ء- ۱۹۹۳ء) کا شمار محققین غالب کی پہلی نسل میں کیا جاتا ہے۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے ان سے ایک ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ۱۹۸۱ء سے ان کی وفات ۱۹۹۳ء تک مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا، لیکن میرے ذخیرۂ خطوط میں صرف ان کے ۱۷ مکتوب محفوظ رہ سکے۔ (۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۸ء) بعد کے چند خطوط متفرق فائلوں میں دب دبا گئے اور تلاش کے باوجود نہیں مل سکے، ممکن ہے آیندہ کبھی ہاتھ آ جائیں، ان میں چند خط مکتوب نگار کی تالیف ''تذکرۂ ماہ وسال'' (دہلی نومبر ۱۹۹۱ء) سے متعلق ہیں، جو بہت معلوماتی ہیں۔ ایک کاروباری شخص کا یہ المیہ ہے کہ اس کی میز دو قسم کی فائلوں سے اٹی رہتی ہے، کبھی کوئی فائل نمایاں توجہ حاصل کر لیتی ہے اور کبھی کوئی عدم توجہ کا شکار ہو کر فائلوں کے انبار کا حصہ بن جایا کرتی ہے۔ میرے ساتھ شروع دن سے آج تک یہی ہوتا رہا ہے، اسی لیے میرے بہت سے کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔

مالک رام کے زیر نظر خطوط سے غالب سے متعلق جہاں متعدد امور پر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں ان کی شخصیت کے حسن کو بھی ان میں محسوس کیا جا سکتا ہے، اپنے خردوں کے ساتھ محبت و شفقت کا سلوک، ان کو کبھی چھوٹے ہونے کا احساس نہ دلانا، علمی معاملات میں تعاون سے دریغ نہ کرنا، اپنے کتب خانے اور ذاتی مسودات سے استفادے کی راہ ہموار کرنا یہ ایسے اوصاف ہیں جن کو ہماری نسل کے لوگ شاید اختیار نہیں کر پائے، اسی لیے ہمارے بعد کی نسل میں وہ رواداری، وہ تہذیب، وہ شائستگی پنپ نہیں پا رہی ہے جو ہمارے بزرگ نمونے کے طور پر ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ ان خطوط کو شائع کرنے کا مقصد دراصل یہی ہے کہ لوگ جان سکیں کہ ہمارے بزرگوں کا اپنے خردوں کے ساتھ رویہ

۵۸- نیو آزاد پرم کالونی، عزت نگر، بریلی، موبائل: ۹۸۳۷۰۹۲۲۴۵۔

کیا تھا۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ اب کسی کتاب کی رسید دینا بھی بار سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً خردوں کے ساتھ ہمارا رویہ احساس برتری کے اظہار کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ اللہ اپنا فضل فرمائے۔

مالک رام عموماً Inland Letter پر خط لکھا کرتے تھے۔ پوسٹ کارڈ یا لیٹر پیڈ کا استعمال کبھی کیا ہو تو میرے علم میں نہیں۔ پتا انگریزی میں لکھتے لیکن Sender's Name and Address کی جانب صرف اپنا نام اور نئی دلی مع پن کوڈ اردو میں لکھتے۔ اس معمول میں بھی کبھی فرق نہیں دیکھا۔

ان خطوط کا مطالعہ کرتے وقت اس خوبی کا اعتراف کیے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا کہ خطوط نگاری کے اجزائے ترکیبی کا ان میں خاص اہتمام ملتا ہے۔ رموز اوقاف پر بھی پوری توجہ دی گئی ہے۔ خط کا ایک عکس پیش کیا جا رہا ہے، جس سے میرے بیان کی تصدیق ہوگی۔ خطوط کو غیر ضروری حواشی سے زیر بار نہیں کیا ہے، البتہ جہاں خط کے مضمون کی وضاحت کے لیے حاشیہ ناگزیر تھا، وہاں حاشیہ دے کر خط کے مضمون کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر قارئین نے خطوط کے اس سلسلے کو پسند کیا تو دوسرے مشاہیر: اختر انصاری، رشید حسن خاں، رام لعل، جگن ناتھ آزاد، حنیف نقوی، آل احمد سرور، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کے علمی خطوط بھی مرتب کر کے شائع کر دیے جائیں گے۔

(۱)

C-504, Defence Colony
New Delhi 110024

۲۳/ مارچ ۱۹۸۱ء

مکرمی! آداب

۱۸/ مارچ کے گرامی نامے کا شکریہ! بہت خوشی ہوئی کہ آپ ''شعرائے بدایوں'' کا تذکرہ لکھ رہے ہیں (۱)، میں آج کل ''تلامذۂ غالب'' (۲) پر نظر ثانی کر رہا ہوں۔ اس میں بعض شعرائے بدایوں بھی ہیں، جن کے حالات میں مجھے آپ کے تذکرے سے ضرور مدد ملے گی۔ انشاء اللہ۔

جہاں تک میرا ناقص مطالعہ ہے، غالب کبھی بدایوں نہیں گئے، اگر محکمہ اطلاعات ونشریات کی کسی رپورٹ میں ایسا شائع ہوا ہے تو کیا وہاں کوئی سند درج کی گئی ہے (۳)، کم از کم میرے علم میں یہ ٹھیک نہیں خدا کرے، آپ بعافیت ہوں، آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(پس نوشت: آپ نے ناحق لفافہ ملفوف کیا۔)

(۲)

C-504, Defence Colony
New Delhi 110024

۵/اپریل ۱۹۸۱ء

مکرمی! آداب۔ ۲۹/مارچ کے گرامی نامے کا شکریہ۔ (۴)

۱۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے میرن صاحب کی سند پر لکھا ہے کہ مرزا غالب نے قادر نامہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی تعلیم کے لیے لکھا تھا۔ اس کا جو ایڈیشن پروفیسر عبدالقوی دسنوی (صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال) نے شائع کیا ہے اس کے دیباچے میں مختلف اڈیشنوں کی تفصیل دی ہے۔

۲۔ اس وقت سکسینہ صاحب کا مضمون (۵) میرے سامنے نہیں بلکہ یہ بھی یاد نہیں آرہا کہ یہ میری نظر سے گزرا ہے کہ نہیں۔ میں عزیز الدین عزیزؔ (۶) اور رام دیال رساؔ (۷) دونوں کو نہیں جانتا۔ جب تک معتبر شہادت موجود نہ ہو، کیسے تسلیم کرلیا جائے۔

۳۔ غالب نے ازالۂ حیثیتِ عرفی اور ہتک عزت کا مقدمہ مولوی امین الدین امین دہلوی مصنف قاطع القاطع پر دائر کیا تھا، یہ وکالت اسی سلسلہ میں تھی۔ اس مقدمہ کی روداد کی اشاعت کا پروفیسر مختارالدین احمد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہ روداد از خود شائع کی تھی۔ اختلاف رائے کوئی بری بات نہیں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو میں اس کی نشاندہی پر آپ کا ممنون احسان ہوں گا۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔

آپ کا مضمون کب تک شائع ہورہا ہے۔ (۸)

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۳)

C-504, Defence Colony
New Delhi 110024

۵؍مئی ۱۹۸۱ء

مکرمی! آپ کے ۱۵؍اپریل کے گرامی نامے کا جواب اور 'روشن' کے فانی نمبر (۹) کی رسید بہت دیر سے لکھ رہا ہوں۔ شامتِ اعمال کے سوائے اور کیا کہوں!

۱۔ ''قادرنامہ'' (۱۰) کا کوئی بدایونی ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں۔ کتاب کسی کا کاپی رائٹ نہیں جو چاہے اسے شائع کرے۔ اس میں ردوبدل تو ہو نہیں سکتا۔ ''قادرنامہ'' سے متعلق کچھ تفصیلات میری کتاب ''ذکر غالب'' میں شامل ہیں، اور وہاں حوالے بھی ہیں۔

۲۔ اس مقدمے (۱۱) کی روداد مولوی عبدالحق مرحوم نے 'اردو' اپریل ۱۹۴۳ء میں شائع کی تھی، وہیں سے پروفیسر مختارالدین احمد نے لے کر ''احوال غالب'' میں شامل کی، وکیل کا نام منشی عزیزالدین تھا (ممکن ہے ان کا تخلص عزیزؔ اور صادقؔ ہو) تفصیل کے لیے دیکھیے ''ذکر غالب'' (آپ نے جس عزیزالدین کا نام لکھا ہے ان کے حالات کہاں ملیں گے؟)۔ (۱۲)

۳۔ حکیم غلام نجف خاں (۱۳) کے حالات میں نے مدت ہوئی ایک مضمون میں لکھے تھے جو 'آجکل' (فروری ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا تھا۔ افسوس کہ اس کا کوئی نسخہ میرے پاس نہیں۔ اگر آپ مدیر آجکل کو لکھیں تو وہ شاید اس کی نقل مہیا کر سکیں۔

۴۔ کلوؔ اور کلیانؔ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں، کلو کا اصلی نام کالے خاں تھا اور وہ مسلمان تھا۔ یہ غالب کا داروغہ تھا، کلیان ہندو تھا اور بازار کے چھوٹے موٹے کام اس کے سپرد تھے۔ خدا معلوم یہ کہاں کے رہنے والے تھے!

۵۔ کوئی ببلوگرافی بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی ہر ایک قابل تعریف ہے کہ اس نے اپنی بساط بھر کام کرنے سے کوتاہی نہیں کی۔ میرے خیال میں سید معین الرحمٰن (پاکستان) کی کتاب (۱۴) سب سے بہتر ہے۔

فانی نمبر ملا۔ شکریہ!

افسوس کا مقام ہے کہ فانی کی مکمل سوانح عمری آج تک مرتب نہیں ہوئی۔ اس کے لیے ضرورت ہے بدایوں، آگرہ، علی گڑھ، حیدرآباد اور کہاں کہاں جانے اور وہاں کے بڑے بوڑھوں کے

ساتھ بیٹھنے اور ان سے حالات معلوم کرنے کی، اور اتنی محنت کوئی کرنے کو تیار نہیں اور اندیشہ ہے کہ اگر اور تاخیر کی گئی تو چند دن میں وہ اصحاب بھی اللہ کو پیارے ہوجائیں گے جو فانی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر آپ خود یہ کام کردیں یا اور کسی مستعد آدمی سے کرا سکیں تو یہ اردو پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ یوں بھی فانی کا بدایوں پر جو حق ہے اس کے ادا کرنے کا آپ کو خیال ہونا چاہیے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۴)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۴؍ جولائی ۱۹۸۱ء

مکرمی! یکم جولائی کے گرامی نامے کا شکریہ۔

میں آپ کے سب خطوں کا جواب دے چکا ہوں۔ میرے پاس آپ کا کوئی جواب طلب خط نہیں ہے۔ حتی الوسع احباب کے خطوں کے جواب میں سہل انگاری سے کام نہیں لیتا، الاّ یہ کہ کوئی خاص مانع درپیش آجائے۔

خدا کرے آپ ہر طرح بخیریت ہوں۔ آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۵)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۳؍ جنوری ۱۹۸۲ء

محبی! بہت دن ہوئے آپ کا مرسلہ تحفہ ''دیدودریافت'' (۱۵) موصول ہوا تھا۔ اس کے

بعد چند دن ہوئے گرامی نامہ بھی ملا جس میں شکایت تھی کہ میں نے کتاب کی رسید نہیں لکھی۔

ہوا یہ کہ جب کتاب ملی ہے میں نے اس کے ۳۰۔۴۰ صفحات پہلی نشست میں دیکھ ڈالے، اس کے بعد کتاب غائب ہوگئی۔ کوئی لے نہیں گیا بلکہ دوسری کتابوں اور کاغذوں کے ساتھ بیوی نے اسے احتیاط کے ساتھ کتاب خانے میں طاق پر رکھ دیا، بقیہ دیکھ نہ سکا۔

پھر حسب معمول طبیعت بگڑ گئی بہت بگڑ گئی۔ اسپتال تک نوبت آئی، بحمدہٖ اب روبصحت ہوں۔ کتاب میں نے نکلوالی ہے۔ اسے پھر شروع سے پڑھ کر عنقریب لکھوں گا۔ ان شاء اللہ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۶)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۵/دسمبر ۱۹۸۲ء

مکرم بندہ جناب شمس صاحب آداب!

شرمسار ہوں کہ آپ کے ۳۰/اگست ۱۹۸۲ء کے گرامی نامے کا جواب اتنی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ باور فرمایئے کہ جب بھی آپ کا خط جواب طلب خطوط کے پلندے میں نظر سے گزرا، ضمیر نے سرزنش کی لیکن مکروہات کا بھلا ہو کہ آج تک دو سطر لکھنے کی فرصت نہ ملی۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ 'روشن' (۱۶) کو تماہی تخلیقی اور تحقیقی پرچے میں تبدیل کر رہے ہیں۔ یہ کام جرأت رندانہ کا ہے۔ اردو والوں کو میں آپ سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں۔ یہ لوگ پَرلے درجہ کے بے حس ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ کیا ان کے لیے مفید ہے۔ بہرحال دعا گو ہوں کہ اللہ کریم آپ کا حامی و ناصر رہے۔

رہا مضمون لکھنے کو تو بھائی وعدہ نہیں کرتا کہ پھر اس کا ایفا فرض ہو جائے گا اور میری صحت کا جو عالم ہے اس میں کوئی پابندی اپنے اوپر عائد کر لینا ٹھیک نہیں۔ آپ دعا کیجیے گا اگر کچھ لکھ سکا اور آپ

کے لائق ہوا تو دریغ نہیں کروں گا۔ پرچہ کب تک شائع ہو رہا ہے؟

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۷)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۱۵/اپریل ۱۹۸۳ء

مکرمی شمس صاحب، آداب!

میں آج کل ''تلامذۂ غالب'' پر نظر ثانی کر رہا ہوں۔ اسی سلسلہ میں آپ کی تالیف منیف ''دید و دریافت'' کو بھی پھر دیکھا۔

سب سے پہلے قاضی عنایت حسین رشکی (۱۷) کے سلسلہ میں معلومات کی تشنگی محسوس ہوئی:

۱۔ ان کے والد محمد تقی مہدی کیا کرتے تھے؟ ان کا انتقال کب ہوا؟

۲۔ یہی سوال ان کے نانا قاضی عبدالسلام کے متعلق بھی ہے۔

۳۔ کیا ان کی دونوں بیویوں کے بارے میں کچھ تفصیل معلوم ہو سکتی ہے؟ یعنی ان کے والد کا نام؟ ان کا اپنا نام، تاریخ وفات وغیرہ؟

۴۔ کیا رشکی کی تصویر موجود ہے۔ (۱۸)

۵۔ اس وقت خاندان کے کون کون لوگ ہیں؟ جہاں تک تصویر کا تعلق ہے، غالب کے تمام دوسرے تلامذہ کی تصاویر بھی اگر مہیا ہو سکیں تو کہیں سے پیدا کیجیے۔ ابھی امکان ہے کہ ان کے خاندانوں میں موجود ہوں۔ بعد کو ضائع ہو جائیں گی۔ آپ نے کسی زمانہ میں اطلاع دی تھی کہ آپ 'روشن' کو تماہی میں تبدیل کرنے والے ہیں۔ پھر معلوم نہیں ہوا کہ کیا یہ ارادہ عمل میں آیا یا نہیں۔

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں، آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۸)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۷؍جون ۱۹۸۳ء

مکرمِ من، آداب! ۱۸؍مئی کے گرامی نامے 'روشن' کے شمارۂ اول اور رشکی کی تصویر سب کے لیے شکریہ قبول فرمایئے۔

مدہوش (۱۹) کے رقعات کا نسخہ میری نظر سے گذرا ہے لیکن اس میں تصویر نہیں تھی (کسی نے نکال لی ہوگی) میں نے یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ سے منگوایا تھا۔ اگر اس کتاب کے نسخے وہاں بدایوں میں دستیاب ہوسکتے ہیں اور اس میں تصویر شامل ہے تو اسے میرے نام وی۔ پی کروا دیجیے گا اور اگر یہ ممکن نہیں تو کسی طرح تصویر مہیا کر دیجیے۔ میں اس کا بلاک تیار کرا کے اصل تصویر واپس کر دوں گا۔

میں اس وقت بے حد الجھا ہوا ہوں۔ کچھ اپنے کام اور کچھ بیکار کے۔ لہٰذا فوری طور پر کوئی مضمون نہیں لکھ سکوں گا۔ چندے صبر کیجیے، ان شاء اللہ جونہی کوئی مفید چیز ہوگئی پیش کروں گا۔ آپ کو میری حالت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ کبرسنی، خرابِ صحت، دنیوی مکروہات غرض کس کس چیز کا ذکر کروں۔ دعا کا طالب ہوں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر رہے، آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

پس نوشت: عزیز الدین صادق کے بارے میں تو لکھنا بھول ہی گیا، ان کی تصویر کہاں سے ملے گی؟ یہ بھی عنایت فرمایئے۔ اصل تصویر واپس کر دوں گا۔

(۹)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۱۴؍اکتوبر ۱۹۸۳ء

مکرم بندہ آداب! گرامی نامے کا شکریہ۔

ڈاکٹر قادری (۲۰) اور ڈاکٹر حنیف نقوی کی نگارشات میری نظر سے گذری ہیں۔ 'روشن' کا شمارہ ۲ مجھے نہیں ملا۔ مدہوش کی تصویر کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۰)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۳۰/ اکتوبر ۱۹۸۳ء

حضرت! میں نے کہا تھا کہ مدہوش کی تصویر فوراً بھیج دیجیے، یہ 'رقعات مدہوش' کے ساتھ بھی شائع ہوئی ہے، اگر اس کتاب کا ایک نسخہ بھی مہیا ہوسکے تو عنایت فرمایئے۔ تصویر اسی سے لے لوں گا۔

اس خط کا جواب جلد لکھنے کی زحمت کیجیے۔ جناب ویریندر پرشاد سکسینہ سے بھی میں نے درخواست کی تھی کہ اگر ان کے پاس کسی ایسے شاگرد غالب کی تصویر ہو جو 'تلامذۂ غالب' میں شامل نہیں ہے تو عنایت فرمائیں، اگر ان سے ملاقات ہو تو ان سے بھی جلد جواب دینے کی سفارش کیجیے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۱)

C-504, Defence Colony

New Delhi 110024

۲۳/ ستمبر ۱۹۸۳ء

مکرمی! آپ نے میرے گذشتہ عریضے کا جواب نہیں دیا، میں نے دریافت کیا تھا کہ کیا رشکی کے علاوہ کسی اور صاحب کی تصویر بھی دستیاب ہوسکتی ہے؟

کل یونہی سرسری طور پر "دید و دریافت" دیکھنے کا موقع ملا، اتفاق سے منشی عزیز الدین عزیز و صادق کے حالات پر نظر پڑی (ص: ۴۰) آپ نے ان کی تاریخ ولادت ۱۷/ صفر ۱۲۴۴ھ لکھی ہے، سال ۱۲۴۴ھ کی تصدیق تو "انساب شیوخ فرشوری" (رضی الدین بسمل) سے بھی ہوتی ہے جو یقیناً

ٹھیک ہوگی کیونکہ مصنف ان کے بھتیجے ہیں لیکن یہ "۱۷رصفر" کی سند کیا ہے؟(۲۱)

میں نے جناب ویریندر پرشاد سکسینہ کو دوخط لکھے، ان کا جواب نہیں ملا، جس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا پتا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا کسی شاگرد کی ان کے پاس تصویر ہے؟ اگر ان سے ملاقات ہو تو اس سوال کا جواب معلوم کر کے لکھیے اور ان کا موجودہ پتا بھی بتائیے تاکہ میں خود بھی عندالضرورت انھیں لکھ سکوں۔

اگر بسمل کی کتاب "کنزالتواریخ" (۲۲) (صحیح: کنزالتاریخ) کا نسخہ آپ کے پاس موجود ہو تو اسے چند دن کے لیے مستعار عنایت کیجیے۔ دیکھ کر ان شاء اللہ بحفاظت واپس بھیج دوں گا۔ بسمل کی یہی ایک کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

پس نوشت: کیا مدہوش کی تصویر کہیں سے ملنے کی امید ہے؟

(۱۲)

دہلی، ۹رجون ۱۹۸۴ء

محبی! بہت دن سے آپ نے یاد نہیں فرمایا۔ خدا کرے آپ ہر طرح سے بخیر و عافیت ہوں، آمین۔ اس وقت ایک افسوسناک اطلاع دینے کو لکھ رہا ہوں۔ آپ نے براہ کرم عنایت حسین رشکی وفراق کی تصویر مہیا کی تھی۔ کتاب مکتبۂ جامعہ شائع کر رہا ہے۔ میں نے وہ تصویر بلاک تیار کرنے کو جناب شاہد علی خاں کے حوالہ کر دی تھی کل وہ آئے اور یہ خبر دی کہ تصویر کہیں گم ہوگئی ہے۔ تکلیف تو بہت ہوئی لیکن اب کیا کرسکتا ہوں! یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ براہ کرم کوشش کر کے دوسری تصویر کسی طرح سے بھی ہو پیدا کیجیے ورنہ کتاب کا جو صفحہ درمیان میں خالی چھوڑ رکھا ہے اسے پُر کرنے کی کوئی صورت نہیں گویا دوہرا نقصان ہوگیا۔ یہ کام بہت عجلت کا ہے۔ سب کام چھوڑ کر اسے کیجیے، کرم ہوگا۔ والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۳)

دہلی، ۱۶رجون ۱۹۸۴ء، اشد ضروری۔

محبی! دو تین دن ہوئے، میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ پتا

نامکمل (یا شاید غلط) تھا اس لیے ممکن ہے کہ آپ کو ملا ہی نہ ہو، لہٰذا دوبارہ لکھ رہا ہوں۔

آپ نے تلامذہ کے لیے عنایت حسین رشکی وفراق کی تصویر عنایت کی تھی۔ میں نے دوسری تصاویر کے ساتھ یہ بھی شاہد علی خاں صاحب جنرل منیجر جامعہ لمیٹیڈ کے حوالے کردی تھی۔ کتاب چھپنے لگی تو معلوم ہوا کہ یہ تصویر گم ہوگئی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پوری کتاب چھپ چکی ہے۔ صرف وہ فارم جس میں یہ تصویر شامل ہوگی چھپنے سے رہ گیا ہے۔ چونکہ کتاب آفسیٹ پر چھپی ہے درمیان میں اس تصویر کے لیے صفحہ خالی رکھا گیا تھا اور اس کا عکسی نگیٹو بن چکا ہے، میں نے درخواست کی تھی کہ جیسے بھی ممکن ہو اس تصویر کا ایک اور عکس پیدا کیجیے۔ کام مشکل ضرور ہے لیکن غالباً ناممکن نہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر یہ کام بلاتاخیر کردیا جائے۔

یہ کتاب (۲۳) میری تمام توقعات کے خلاف دو سال سے معلّق تھی، اب کہ اس کی طباعت آخری مراحل پر پہنچ گئی ہے، یہ امر حائل ہوگیا ہے اور اس کا مداوا آپ ہی تلاش کرسکتے ہیں۔

پس پوری توجہ فرمایئے، شکریہ۔ والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۴)

نئی دہلی، ۲۴؍ جون ۱۹۸۴ء

محبی مکرم شمس صاحب! آداب۔

آپ کا گرامی نامہ ملا اور سخت مایوسی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے دوسری تصویر دستیاب ہوجائے گی لیکن بے سود۔

اب ایک اور کام کیجیے۔ ان کے خاندان سے یا احباب سے اگر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک غزل یا کوئی اور تحریر مہیا ہوجائے تو وہ حاصل کیجیے ہم خالی جگہ پر اس تحریر کا عکس شائع کردیں گے۔ یہ کام اتنا ضروری ہے کہ ایک آدمی کو خاص اس کام کے لیے ہدایوں بھیج رہا ہوں۔ کام ضروری بھی ہے اور اشد عجلت کا بھی۔ محض اس ایک فرمے کی وجہ سے کتاب کی طباعت مکمل نہیں ہوسکی۔ یہ کام کردیجیے، بقیہ پھر کبھی۔ والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۵)

C-504, Defence Colony
New Delhi 110024

۱۵/ مارچ ۱۹۸۶ء

مکرم بندہ آداب! ایک مدت سے نہ نامہ ہے نہ پیام ہے، خدا کرے آپ ہر طرح بخیرو عافیت ہوں، آمین۔

۱۹۸۵ء مجھ پر بہت سخت گزرا، دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ پہلے بائیں کا پھر دائیں کا۔ اس سے بہت تکلیف اٹھائی اور تقریباً سال بھر لکھنے پڑھنے کا کوئی کام نہ ہوسکا۔ بحمدہٖ تعالیٰ اب کچھ افاقہ ہے لیکن ہنوز صورت حال تسلی بخش نہیں ہے اور تھوڑی بہت تکلیف جاری ہے۔ طالب دعا ہوں۔ اللہ کریم اپنا فضل شامل حال رکھے، آمین۔

۱۔ رفیق مارہروی (۲۴) کس قبرستان میں دفن ہوئے؟

۲۔ ویریندر پرشاد سکسینہ (۲۵) کی کون سی کتاب چھپ چکی ہے؟

آپ نے ایک نمبر میں ان کے چند مضامین شائع کیے تھے۔ وہ کوئی صاحب اٹھا کر لے گئے، اگر وہ پرچہ مل سکے تو شکر گذار ہوں گا۔

۳۔ بدایوں کے تازہ پرچے میں بعض شعرا وغیرہ کے حالات ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ مزید معلومات درکار ہیں لیکن فوری طور پر وہ پرچہ دستیاب نہیں ہوا پھر لکھوں گا۔

۴۔ وہ میری شعروں والی بیاض (۲۶) اگر فارغ ہوگئی ہو تو واپس بھیج دیجیے تا کہ وہ کام جاری رکھ سکوں۔ آپ کی دی ہوئی مدہوش کی تصویر بھی کہیں پڑی ہے۔ اسے واپس کروں گا۔

فقط والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۶)

C-504, Defence Colony
New Delhi 110024

۱۸/ نومبر ۱۹۸۷ء

مکرم بندہ! آداب قبول فرمائیے۔

پرسوں مکاتیب شمیم (۲۷) کا نسخہ موصول ہوا۔ شکریہ، بہت اچھے خط ہیں، میں نے جگر مرحوم کی زندگی میں ان سے مستعار لے کر پڑھے تھے۔ آپ نے انھیں محفوظ کر کے ایک اچھا کام کیا۔ جزاک اللہ!

میں نے درخواست کی تھی کہ ''کس کا شعر ہے'' کا مسودہ واپس بھیج دیں تو میں وہ کام جاری رکھ سکتا ہوں۔ مکمل ہو جائے، تو کیا برا ہے! آپ نے جواب نہیں دیا۔　　والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۱۷)

نیا سال مبارک ہو۔

۳/جنوری ۱۹۸۸ء

محبی! میں پچھلے دو ڈھائی برس سے بہت علیل ہوں۔ مختلف عوارض کی آماجگاہ بن گیا ہوں۔ پڑھنے لکھنے میں بھی تکلف ہوتا ہے، جس پر یہ تحریر ہی دال ہے۔

بہر حال بطور تعارف چند سطریں بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے پسند آجائیں۔ نہ آئیں تو پھاڑ کے پھینک دیجیے، تصویر (مدہوش) فوری طور پر نہیں ملی، جب آپ تشریف لائیں گے تو پیش کر دوں گا، ان شاءاللہ۔　　والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

حواشی

(۱) اس زمانے میں، میں شعرائے اردو کے تذکروں اور بدایوں کے بزرگوں سے تذکرہ شعرائے بدایوں کے لیے خام مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ تذکرہ مرتب کرنے کا ارادہ تھا، لیکن جب مجھے علم ہوا کہ شہید حسین شہید (ف ۱۹۸۸ء) بڑے پیمانے پر یہ کام انجام دے رہے ہیں اور خاص اسی کام کے لیے وہ دسمبر ۱۹۸۰ء میں کراچی سے بدایوں تشریف لائے تو میں نے جمع شدہ خام مواد ان کی نذر کر دیا۔ کچھ کا انھوں نے عکس لے لیا اور کچھ کو نقل کیا، بعد میں یہ تذکرہ دو جلدوں میں باسم ''تذکرہ شعرائے بدایوں'' کراچی سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ یہ جمع شدہ خام مواد تذکرہ نعت گویان بدایوں کی ترتیب کے دوران کام آیا، جس کا پہلا ایڈیشن باسم ''شعرائے بدایوں دربار رسول میں'' ۱۹۸۸ء میں بدایوں سے اور طبع ثانی کراچی سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ (۲) تلامذۂ غالب طبع اول مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء، طبع دوم مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی ۱۹۸۴ء۔ (۳) صباح الدین عمر کے مرتب کردہ انگلش رسالے

باسم اتر پردیش (ناشر محکمہ اطلاعات ونشریات لکھنؤ ۱۹۷۷ء) میں غلطی سے باندہ کو بدایوں لکھ دیا گیا تھا۔ یہ سوال اسی تناظر میں تھا۔ (۴) ان دنوں میں غالب اور بدایوں، موضوع کے تحت مقالہ لکھ رہا تھا، اسی سلسلے میں مالک رام سے متعدد سوالات کیے گئے تھے۔ یہ مقالہ پہلے پہل میرے مضامین کے مجموعے (دیدو دریافت، دہلی ۱۹۸۱ء) میں بہ عنوان ''غالب بدایوں میں'' شائع ہوا۔ (ص: ۲۲ تا ۶۴) بعدازاں کتاب کا عنوان بن کر (غالب اور بدایوں) غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ (۵) مراد ویریندر پرشاد سکسینہ (ف ۲۰۱۰ء)۔ (۶) یہاں مالک رام کو دھوکا ہوا، تلمیذ غالب عزیز الدین عزیز کا ذکر وہ تلامذۂ غالب میں کر چکے تھے۔ (۷) ویریندر پرشاد سکسینہ نے اپنے مضمون ''رام دیال رسا'' (مطبوعہ پگڈنڈی امرتسر، جنوری ۱۹۶۱ء) اور اپنی کتاب ''بدایوں کے اساتذۂ سخن'' (کراچی ۱۹۹۲ء، ص ۱۲) میں انھیں غالب کا شاگرد لکھا ہے، جو غلط ہے۔ دیکھیے: (غالب اور بدایوں، ص: ۱۲۸-۱۲۹)۔ (۸) یہ دیدودریافت میں شامل مقالہ ہے۔ طوالت کے سبب یہ کسی رسالے میں شائع نہیں ہوسکا۔ (۹) ماہنامہ 'روشن' بدایوں کا فانی نمبر مطبوعہ جنوری ۱۹۸۱ء۔ (۱۰) قادرنامہ کے متعدد ایڈیشن مختلف مطابع سے شائع ہوئے ہیں۔ ۱۸۸۳ء میں ایک ایڈیشن مطبع صبح بدایوں سے بھی شائع ہوا تھا۔ اسی کا تذکرہ ہے۔ (۱۱) قاطع القاطع کے مصنف امین الدین دہلوی پر مرزا نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ ۲؍ستمبر ۱۸۶۷ء کو دائر کیا تھا۔ غالب کے شاگرد عزیز الدین عزیز وصادق اس مقدمے میں غالب کی جانب سے وکیل تھے۔ ۲۳؍مارچ ۱۸۶۸ء کو دونوں فریقین کے درمیان راضی نامہ داخل عدالت کرنے پر مقدمہ خارج ہوگیا۔ اس مقدمے کی پوری مِسل ''مقدمۂ غالب'' کے نام سے رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، یہ ۱۸؍اوراق پر مشتمل ہے اور عزیز کی مرتبہ ہے۔ اسی کی نقل مولوی عبدالحق نے اردو اورنگ آباد میں شائع کی تھی۔ بعد میں اسے احوال غالب (علی گڑھ ۱۹۵۳ء) میں بھی شامل کیا گیا، لیکن رضا لائبریری رامپور میں اس کے خطی نسخے کا تذکرہ دونوں بزرگوں نے نہیں کیا۔ (۱۲) عزیز الدین وکیل اور عزیز الدین عزیز وصادق تلمیذ غالب ایک ہی شخص ہیں۔ مکتوب نگار کے حافظے نے دھوکا دیا۔ (۱۳) حکیم غلام نجف خاں (ف ۱۸۸۹ء) غالب کے مکتوب الیہ بھی ہیں، شاگرد بھی اور منہ بولے بیٹے بھی۔ ان پر تفصیلی مقالہ راقم الحروف کی کتاب غالب اور بدایوں (ص: ۱۳۵ تا ۱۵۶) میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ مقالہ ماہنامہ آجکل دہلی، فروری ۲۰۰۴ء میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مالک رام کا مضمون سرسری معلومات پر مبنی ہے۔ (۱۴) اشاریہ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مجلس یادگار غالب، لاہور ۱۹۶۹ء۔ (۱۵) میرا بدایوں کے شعرا و ادبا سے متعلق مضامین کا پہلا مجموعہ، مطبوعہ ۱۹۸۱ء۔ (۱۶) ماہنامہ 'روشن' بدایوں (اجرا فروری ۱۹۷۸ء) جدیدیت کا علم بردار تھا۔ بعد میں اسے تحقیقی پرچے کی صورت دی گئی جس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ مالک رام خود بھی ایک سہ ماہی پرچہ 'تحریر' دہلی سے جاری

کر چکے تھے جو خالص علمی و تحقیقی مجلہ تھا۔ اسی لیے وہ روشن کی اس نئی شکل کے بارے میں پُرتشویش تھے۔ (۱۷) یہ غالب کے شاگرد تھے۔ غالب اور بدایوں میں ان کے تفصیلی حالات آ گئے ہیں اور ایک قلمی بیاض کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ (۱۸) رشک کی تصویر ان کے خاندان کے افراد سے حاصل کر کے مکتوب نگار کو بھیج دی گئی تھی۔ (۱۹) رقعات مدہوش طبع اول مطبع افضل المطابع وسعید الاخبار بدایوں مئی ۱۸۷۹ء بار دگر نظامی پریس بدایوں ۱۹۶۳ء۔ (۲۰) مراد ڈاکٹر محمد ایوب قادری (ف ۱۹۸۳ء) نگارشات سے مراد وہ مضامین ہیں جو تلامذۂ غالب طبع اول کے سلسلے میں لکھے گئے، جن میں بعض تسامحات کی نشاندہی تصحیحات اور اضافے کیے گئے ہیں۔ (۲۱) یہ تاریخ میں نے تلمیذ غالب عزیز الدین عزیز وصادق کے پوتے مولوی قمر الدین احمد قمر (مصنف بزم اکبر ومحفل عزیز) کے مرتبہ 'انتخاب عزیز' کے قلمی نسخے سے حاصل کی تھی۔ انساب شیوخ فرشوری مطبوعہ کاکس پریس شاہ آباد، ۱۸۹۹ء۔ (۲۲) مولوی رضی الدین بسمل کی تاریخ بدایوں پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ (۲۳) مراد تلامذۂ غالب، طبع دوم ۱۹۸۴ء۔ (۲۴) سید رفیق مارہروی (ف ۱۹۶۷ء) احسن مارہروی کے فرزند تھے۔ ان کی تدفین مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں اپنے خاندانی قبرستان میں ہوئی تھی۔ (۲۵) راقم الحروف نے ویریندر پرشاد سکسینہ کے ۹ مضامین کا مجموعہ باسم 'ادبی زائچے' روشن پبلی کیشنز بدایوں کی جانب سے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا۔ اسی کو سہ ماہی روشن کے ایک خصوصی شمارے کے طور پر بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ (جلد ۸، شمارہ ۲، ۱۹۸۵ء)۔ (۲۶) ضرب المثل اشعار پر مشتمل میری مرتبہ کتاب 'شعری ضرب الامثال' روشن پبلی کیشنز بدایوں سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ مالک رام کو یہ کتاب پسند آئی تھی۔ اسی نوعیت کی انھوں نے بھی ایک بیاض تیار کی تھی، جس میں وہ اردو و فارسی کے آوارہ اشعار لکھتے رہتے تھے۔ اسے انھوں نے ''کس کا شعر ہے؟'' نام دیا تھا۔ ایک ملاقات کے دوران جب میں نے ان سے 'شعری ضرب الامثال' کے حصہ دوم مرتب کرنے کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ازراہِ علم دوستی اپنی بیاض مجھے سونپ دی۔ یہ بیاض میں انھیں واپس نہیں کر سکا۔ اس خوف سے کہ میرے بعد کوئی اسے اپنے نام سے شائع نہ کرا دے اس کا عکس تعارفی سطور کے ساتھ ماہنامہ 'شاعر' بمبئی (مارچ ۲۰۰۳ء) میں بہ عنوان 'کس کا شعر ہے' (بیاض مالک رام) شائع کرا دیا تھا، بعد میں یہ عالمی اردو ادب، دہلی جلد ۲۲، ۲۰۰۴ء میں بھی شامل ہوا۔ (۲۷) مکاتیب شمیم (فانی بدایونی و جگر بریلوی کے مشترک دوست، منشی من موہن لال ماتھر شمیم بریلوی کے خطوط، مع مقدمہ و حواشی) مطبوعہ رامپور ۱۹۸۷ء (۲۸) چند سطریں سے مراد ۲ صفحات پر مشتمل وہ پیش لفظ ہے جو شعری ضرب الامثال قسط ۲ کے لیے انھوں نے لکھا، جو کتاب میں شامل ہوا، یہ کتاب روشن پبلی کیشنز، بدایوں سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

اخبار علمیہ

''مجموع رسائل السیوطی کی اشاعت کا اعلان''

یہ خبر یقیناً دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ متعدد علوم وفنون کے ماہر اور متبحر عالم علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے ۴۰۰ رسائل پر مشتمل مجموعہ ''مجموع رسائل السیوطی'' کے نام سے تیس جلدوں میں منظر عام پر جلد ہی آنے والا ہے۔اس کا شمار دار اللباب (ترکی) کے سلسلہ مجموعات ''مجامیع رسائل العلماء المحققین'' کے سب سے ضخیم جلدوں میں ہوگا۔اس میں ۸۰ رسائل پر مشتمل ''کتاب الحاوی'' جس کو خود امام سیوطی نے جمع کیا تھا اور ۱۰ ار رسائل پر مشتمل ''کتاب دیوان الحیوان'' شامل ہے۔اس مجموعہ میں ہر رسالہ کا موازنہ ومقارنہ دو اور اس سے زیادہ مخطوطہ نسخوں سے کیا گیا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا اس کے لیے اچھے سے اچھے مخطوطہ نسخوں کو تلاش کیا گیا اور ان کے حصول میں مال صرف ہوا۔چنانچہ بیسیوں ممالک کی دسیوں لائبریریوں سے بہت سے مخطوطات حاصل کیے گئے تاکہ امام سیوطی کی اس علمی میراث کا صحیح ترین نص سامنے آئے۔واضح ہو کہ امام صاحب سے منسوب مطبوعات میں تحریف وتصحیف اور بعض دوسرے نقائص کا امکان موجود ہے۔رپورٹ کے مطابق مجموعہ کے ہر حصہ کے آخر میں محققین اور طلبہ ومتعلمین کے لیے جدید طرز پر ایسی سائنٹفک فہرستیں تیار کی گئی ہیں جن سے انہیں فائدہ ہوگا۔اس مجموعہ کی شروع کی دو جلدوں میں امام سیوطی کے سوانح ان کے دو شاگردوں داؤدی اور شاذلی کے قلم سے ہیں۔ان دونوں جلدوں (کی تحقیق ومراجعت پر) پر ڈاکٹر عبدالحکیم الانیس نے خاص توجہ دی ہے، اس پورے مجموعہ کو اہل علم کی آسانی کے لیے سات حصوں میں شائع کرنے کا خیال ہے تاکہ یہ مجموعہ ان تک یکے بعد دیگرے بہ آسانی پہنچتا رہے۔(بحوالہ دار اللباب، ترکی)

''دائرۃ المعارف کی بعض عربی کتابوں کے انگریزی تراجم''

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کا قیام ۱۸۸۸ء میں میر محبوب علی خاں نظام ہفتم کی سرپرستی میں عمل میں آیا تھا۔اس کا مقصد آٹھویں صدی ہجری سے پہلے کے اہم عربی مخطوطات کی تلاش اور ان

کی تحقیق وتدوین تھا۔اب تک اس ادارہ نے مختلف موضوعات پر ۲۴۰ مخطوطات شائع کی ہیں۔اس کی تفصیل عربی اور انگریزی میں شائع ''الفہرس الوصفی'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس کی موجودہ ڈائریکٹر مہ جبین اختر عثمانیہ یونیورسٹی میں عربی کی پروفیسر ہیں۔خبر کے مطابق عہد حاضر کے تقاضہ کے مطابق گذشتہ پانچ سالوں میں ۲۱/اہم عربی مطبوعات کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاچکا ہے (لیکن رپورٹ میں ایک بھی عربی کتاب یا اس کے انگریزی ترجمہ کا نام موجود نہیں ہے)۔ان کے علاوہ بعض ایسی کتابیں ہیں جو پہلی مرتبہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ہی سے طبع ہوئی ہیں۔ان میں خواجہ گیسودراز کی صوفیانہ تفسیر ''الملتقط'' کی تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔خزانۃ الاکمل (جلداول)،معارف العوارف (جلداول و دوم)،شرح الکرخی (جلداول)،شرح العقائد الصوفیہ،کتاب الاصل،الرسالہ فی تحصیل العلم وغیرہ پہلی مرتبہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ہی سے طبع ہوئی ہیں۔(اعتماد،حیدرآباد، ۷ جنوری ۲۱ء،ص ۳)

''جرمنی میں موسمی نظام ''احمد'' سے موسوم''

جرمن محکمۂ موسمیات ''ڈی ڈبلیوڈی'' نے رومانیہ پر موجود ہوا کے کم دباؤ والے موسمی نظام کا نام ''احمد: Ahmet'' رکھ دیا ہے۔اس کا باضابطہ اعلان ۵ جنوری ۲۱ء کو کیا گیا۔یہ نظام پولینڈ کی طرف بڑھ رہا ہے جو اٹلی پر موجود ہوا کے ایک اور کم دباؤ والے نظام ''لیزا'' سے اور پھر ''الیگزینڈر'' سے ٹکرائے گا جو اسکاٹ لینڈ پر زیادہ دباؤ والا نظام ہے۔خبر کے مطابق یہ پہلا موقع ہے جب جرمنی میں کسی موسمی نظام کو باضابطہ طور پر ''تارکین وطن کا پس منظر رکھنے والا نام'' دیا گیا ہے۔واضح رہے کہ جرمنی میں کوئی بھی شہری معاوضہ دے کر موسمیاتی نظام کو اپنا پسندیدہ نام دے سکتا ہے۔کم دباؤ والے نظام کا معاوضہ ۲۴۰ اور زیادہ دباؤ والے نظام کا معاوضہ ۳۶۰ یورو مقرر ہے۔این،ڈی،ایم ایسے صحافیوں کی جرمن تنظیم ہے جو یا تو خود تارکین وطن میں سے ہیں یا ان کا تعلق تارکین وطن کے کسی نہ کسی خاندان سے ہے۔اس تنظیم نے ۲۰۲۱ء کے لیے موسمیاتی نظاموں کے ۱۴/ایسے نام خرید لیے ہیں جو تارکین وطن کی نمائندگی کرتے ہیں،ان میں سب سے پہلا نام احمد ہے۔اس تنظیم کی جانب سے خریدے گئے دوسرے ناموں میں چنا،خوئے اور رومانی جیسے نام ہیں۔تنظیم کا کہنا ہے کہ جرمنی میں تارکین وطن کی تعداد مجموعی آبادی کا ۲۶ فیصد ہے لیکن جرمنی ذرائع ابلاغ میں ان کی نمائندگی صرف ۵ سے ۱۰ فیصد کے

درمیان ہے۔ #Wether Correction ٹیگ سے چلائی جانے والی ایک آن لائن مہم میں اس تنظیم نے جرمن حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ معاشرہ میں ''نسلی تنوع کی نمائندگی'' بہتر بنائے۔ اس مہم کے تحت ۲۰۲۱ء کے دوران جرمنی میں بننے والے موسمی نظاموں کو عربی، کرد، سلاوی اور دیگر برادریوں سے تعلق رکھنے والے نام بھی دیے جائیں گے۔ اس سے قبل جرمن نام ہی مثلاً گنٹر اور انگیلا وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے۔ موسمیاتی نظاموں کو غیر جرمن ناموں سے موسوم کرانے کا مقصد جرمن معاشرہ میں تارکین وطن کے وجود واہمیت کو اجاگر کرنا بھی بتایا جارہا ہے۔ (اردو ٹائمز، ممبئی، ۶/۱/۲۱ء، ص ۶)

''ڈرونز کی عالمی منڈی میں چین کا دبدبہ''

''ڈرون انڈسٹری انسائٹس'' نے اپنی تازہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ کمرشیل ڈرونز (یو، اے، ویز یا غیر انسانی بردار جہاز) کی عالمی منڈی میں چین تقریباً ۸۰ فیصد حصے کے ساتھ پوری دنیا میں سرفہرست ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران چین میں سولین ڈرونز انڈسٹری نے تیزی سے ترقی کی ہے اور عالمی بازار میں اس کا حصہ ۸۰ فیصد تک پہنچ گیا ہے۔ گذشتہ برس ''مور ڈور انٹلی جینس'' کی ایک ایسی ہی رپورٹ میں کمرشیل ڈرونز کی عالمی منڈی میں چین کا حصہ ۷۰ فیصد سے زیادہ بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ۲۰۱۳ء تک چین میں ڈرونز بنانے والے ۱۳۰/ ادارے تھے جو ۲۰۱۹ء میں ۹ گنا سے زیادہ اضافے کے ساتھ دو ہزار ایک پر پہنچ چکے تھے۔ چین کی ''ڈی جے آئی انوویشن ٹیکنالوجی کمپنی لمیٹڈ'' کو کمرشیل ڈرونز بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی قرار دیا جاتا ہے جو عالمی ڈرون بازار میں تن تنہا ستر فیصد کی مالک ہے۔ ''ڈرون انڈسٹری انسائٹس'' کی جاری کردہ ''یو اے وی مارکیٹ رپورٹ ۲۰۲۰-۲۰۲۵ء'' کے مطابق ۲۰۱۹ء عالمی ڈرون مارکیٹ کا مجموعی حجم تقریباً ۱۸/ ارب امریکی ڈالر رہا۔ ۲۰۲۵ء تک اس کے دگنے سے بھی زیادہ ہوجانے کا امکان ہے۔ چائنیز اکیڈمی آف کامرس میں انٹرنیشنل مارکیٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈپٹی ڈائریکٹر بائی منگ کا خیال ہے کہ چین میں ڈرون انڈسٹری ایک نئی معاشی نمو کی صنعت بن سکتی ہے۔ (تاثیر، پٹنہ، ۷ جنوری ۲۱ء، ص ۷)

(ک۔ ص۔ اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب گجرات

گرامی قدر مدیر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج عالی قرین عافیت ہوگا۔

معارف کا تازہ شمارہ بابت نومبر ۲۰۲۰ء باصرہ نواز ہوا، مذکورہ شمارہ حسب معمول شذرات، مقالات، اخبار علمیہ، معارف کی ڈاک، ادبیات، مطبوعات جدیدہ اور رسید کتب موصولہ پر مشتمل ہے۔

جہاں تک مقالاتی کالم کا تعلق ہے اس میں پانچ مقالات شامل ہیں اور ''قرآن کریم کے منظوم تراجم۔ایک جائزہ'' از ڈاکٹر فہیم الدین وڈاکٹر ہاشمی سید وہاج الدین سرفہرست ہے، مقالۂ مذکور خاصا معلوماتی ہے، اس میں اولاً ۲۲ مکمل اور جزوی مطبوعہ منظوم تراجم قرآن کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ بعدازاں چار غیر مطبوعہ مکمل منظوم تراجم اور ۲۳ جزوی مطبوعہ منظوم ترجموں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

مکمل وجزوی مطبوعہ منظوم تراجم میں چار ترجمے آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں، جن کے عنوانات یہ ہیں: فرمانِ جاوید از عبدالعزیز خالد (لاہور ۱۹۸۸ء)، منظوم القرآن از انجم عرفانی، تیسواں پارہ، مطبوعہ ۱۹۹۹ء، جلد اول ۲۰۰۴ء، بلرام پور، جلد دوم ۲۰۰۵ء، جلد سوم ۲۰۰۵ء، جلد چہارم ۲۰۰۶ء، جلد پنجم پارہ ۲۶ تا پارہ ۳۰، اکتوبر ۲۰۰۶ء، لکھنؤ، منظوم اردو ترجمہ قرآن مجید از سلیم اختر فارانی (م ۲۰۰۷ء) اور نظم القرآن از محمد امین میاں (مطبوعہ ۲۰۰۸ء)۔

منظوم تراجم قرآن کریم بہ شکل آزاد نظم کے ضمن میں عرض ہے کہ راقم الحروف نے بھی تیسویں پارے کی کئی سورتوں کے منظوم ترجمے کا فریضہ انجام دیا ہے، سب سے پہلے سورۃ الاخلاص کا ترجمہ وجود میں آیا جس کی تاریخ تکمیل ۱۷؍جنوری ۱۹۹۳ء ہے، یہ ترجمہ ''توازن'' (مالیگاؤں) کے شمارہ نمبر ۲۷۔۲۸ (۱۹۹۴ء) میں شائع ہوا۔

اس کے بعد سورۃ الفاتحہ کے منظوم ترجمے کی توفیق ارزانی ہوئی، یہ ترجمہ ۲۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو مکمل ہوا، یہ بھی ''توازن'' کے مذکورہ شمارے میں اشاعت پذیر ہوا، منظوم ترجموں کا یہ سلسلہ ستمبر ۱۹۹۳ء تک برقرار رہا اور اس دوران کئی سورتوں کے تراجم عمل میں آئے، ان ترجموں کو خاصی پذیرائی حاصل

☆ شعبۂ فارسی، عربی واردو، فیکلٹی آف آرٹ، ایم۔ایس یونیورسٹی، بڑودہ، گجرات۔

ہوئی، گرامی قدر پروفیسر مختار الدین احمد (م ۳۰ جون ۲۰۱۰ء) نے بھی مجھ ہیچ مداں کی حوصلہ افزائی فرمائی جس کے لیے میں ان کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار رہوا۔

مزید عرض یہ ہے کہ سورۂ قریش کے علاوہ باقی تمام سورتوں کے ترجمے ''توازن'' میں طبع ہوئے، سورۂ قریش کا ترجمہ احمد آباد سے شائع ہونے والے دوماہی ''گلبن'' کے شمارہ بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۸ء میں چھپا، یہ رسالہ اب لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے، مذکورہ چیدہ قرآنی سورتوں کے منظوم ترجموں کا مجموعہ بہ عنوان ''کلام ربانی کی منظوم ترجمانی ۔آزاد نظم کی شکل میں'' جولائی ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا اور اس کی اشاعت کا اعزاز حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر احمد آباد کو حاصل ہوا۔

نمونہ ہائے ترجمہ پیش خدمت ہے:

۱۔سورۃ الاخلاص:

جب رسول اللہؐ سے پوچھا گیا
کون ہے، کیسا ہے آخر وہ خدا؟
ربّ واحد کی طرف سے
لے کے یہ پیغام آئے
دفعتاً روح الامینؑ
آپؐ اے میرے نبیؐ!
کہہ دیجیے
وہ خدا یکتا ہے
اور ہے بے نیاز،
وہ کسی کا باپ ہی ہے
اور نہ بیٹا ہے کسی کا
یہ بھی کہہ دیجیے
کہ اس کون ومکاں کی
بے کراں وسعت میں
اس کا تو کہیں بھی

کوئی بھی ہمسر نہیں......

۲۔ سورۃ القدر:

برکتوں کی رات کی عظمت
بیاں کی ہے
کلامِ پاک میں
ربّ عُلا نے اس طرح:
ہم نے اس قرآن کو
نازل کیا ہے
برکتوں کی رات میں،
آپ اے محبوب! کیا جانیں
فضیلت اور عظمت
برکتوں کی رات کی؟
برکتوں کی رات
بہتر ہے ہزاروں ماہ سے بھی
حکمِ یزدانی سے اس میں
ہوتے ہیں نازل فرشتے
اور جبریل امینؑ
احکامِ ربانی کے ساتھ
یہ شب عظمت ہے یکسر
امن ورحمت کی نوید
از نزولِ شامِ قدسی تا طلوع آفتاب......

یہ چند سطریں اطلاعاً اور تبصرۃً سپردِ قلم کی گئی ہیں، ممکن ہو تو انہیں شائع فرما دیجیے، شکر گزار ہوں گا۔

نیازمند

(جناب) مقصود احمد

وفیات

شیخ یوسف صالح قراچہ ندوی مرحوم

(۱۹۳۶-۲۰۲۰ء)

کاروانِ ملک عدم کا سفر جاری ہے، پہلے ماتم و نوحہ کی مجلسیں کبھی آہ و بکا کے منظر دکھا جاتی تھیں، اب تو لگتا ہے کہ: مرے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا، خدا کی بستی جس تیزی سے اجڑتی جاتی ہے یہ خدا ہی کی مرضی ہے، ہمارا کام تو راضی برضا رہنا ہے، اسی میں مداوا ہے، مرہم ہے اور راحت بھی ہے اور اس ازلی و ابدی سچائی کا اعتراف بھی کہ ہم ہیں تو اسی کے، اس لیے اس تک واپسی ہی حقیقت ہے، راہ یابی بھی اسی میں اور شفایابی بھی ساتھ میں۔

ترکی کے مشہور عالم شیخ یوسف صالح قراچہ کے انتقال کی خبر دسمبر ۲۰ء میں ملی، لیکن ان کی زندگی اور بیماری دونوں کے بارے میں معلومات کم ہی آئیں، وہ دارالمصنّفین کے جشن تاسیس کی سوسالہ تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے، ایک نشست میں ان کا مقالہ بھی تھا اور یہ شبلی و دارالمصنّفین سے ان کے تعلق کی علامت بھی تھا، اس وقت تک یہ نہ معلوم تھا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باقاعدہ طالب علم تھے، ۱۹۵۹-۱۹۶۲ء میں ندوہ اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے بھی سند حاصل کی، ترکی واپس گئے تو جو دولت ہندوستان میں پائی اس کو وہاں تقسیم کرنے لگے، ترکی کے صدر جناب طیب رجب اردگان ان ہی کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہیں، ان کا عمل صرف درس و تدریس تک ہی محدود نہیں تھا، انھوں نے کئی مشاہیر ہند کی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اصل شہرت تو ان کی مترجم ہی کی تھی، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، علامہ اقبال، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مودودی، ان سب کی کئی کتابوں کا ترجمہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ترکی اور ہند میں وجہ امتیاز کیا ہے؟ ہندوستان وہ شاید کئی بار آئے گئے اور ایک صاحب نظر، جوہر شناس کی طرح اپنی نگہ انتخاب کو داد کے قابل بنا گئے، چوراسی برس کی عمر پائی، آخر دنوں میں فالج سے معذور تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ ان پر ایک مفصل مضمون کی ضرورت ہے، یہ چند سطریں بھی برادرم ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کی اطلاعات کی دین ہیں۔

آہ! جناب شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم

(۱۹۳۵-۲۰۲۰ء)

افسوس ۲۵ دسمبر ۲۰۲۰ء کو زبان وادب اور علم ودانش اور تحقیق وتنقید کے ایک کامیاب شہسوار کی شکل میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی سے اردو دنیا محروم ہوگئی اور وہ جو داستان گوئی کو نئی شکل دینے کی تمنا رکھتے تھے، خود ہی ایک داستان بن گئے۔ عجیب داستان، جس کا پہلا صفحہ کبھی کے اعظم گڑھ اور اب کے مئو ضلع کے ایک گاؤں کوئریا پار سے شروع ہوا، ان کی ولادت پرتاپ گڑھ میں ہوئی اور یہ واقعہ ۳۰ ستمبر ۳۵ء کا ہے، ان کا خاندان بھرا پرا تھا، والد سے بڑے چھ بھائی تھے اور ایک کے سوا سب صاحب اولاد تھے، صاحب زمین وجائداد بھی تھے، کچھ لوگ سرکاری ملازمت میں تھے، انگریزی تعلیم سے اسی لیے گریز نہ تھا، ۴۸ء میں ان کے والد صاحب گورکھپور چلے گئے، تعلیم کے سلسلے اسی طرح دراز ہوتے رہے اور فاروقی صاحب بالآخر آئی اے ایس ہوکر چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے لیکن اس مقام بلند سے پہلے بھی ان کی حوصلہ مندیوں کے سامنے کئی موڑ آئے، انگریزی ادب میں ایم-اے کے بعد انھوں نے فرنچ ادب میں پی-ایچ-ڈی کا عزم کیا، محکمہ ڈاک کی بلندترین کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تدریس کے شوق نے بلیا اور اعظم گڑھ کے شبلی کالج کے در ودیوار سے بھی آشنا کیا، شبلی کالج میں وہ شعبۂ انگریزی میں لکچر رہوئے اور بقول ملک زادہ منظور احمد ''فاروقی کا قیام شبلی کالج میں زیادہ دنوں تک نہیں رہا مگر وہ جب تک رہے پائپ پیتے رہے، تاش کھیلتے رہے، نمازیں پڑھتے رہے اور مختلف ذوق کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے''، ملک زادہ مرحوم کی بیان کردہ یہ چار صفات یا بیشتر آخر وقت تک فاروقی صاحب کے ظاہری مرقع میں نظر آتی رہیں لیکن غیر علمی ملازمت اور تدریسی ضوابط وشرائط سے دوچار ہوتے رہنے کے باوجود مطالعہ اور مختلف ذوق کی کتابوں کا مطالعہ ہی ان کی زندگی کا اصل اور سب سے نمایاں عکس اور رنگ ثابت ہوا اور اس دعویٰ کے لیے اب کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، ان کی کتابوں کی ایک فہرست ہے، اس کو ان کے پرستار صرف تخلیقی میراث ہی نہیں کہتے بلکہ اس کے احاطہ کو بھی امر مشکل سے تعبیر کرتے ہیں، ۱۹۶۸ء کی کتاب لفظ ومعنی سے شعر، غیر شعر اور نثر، تفہیم غالب، افسانے کی حمایت میں، تنقیدی افکار ہمارے لیے منٹو صاحب ہوتے ہوئے شعر

شور انگریز کا شور زیادہ ہوا اور کئی چاند والا ناول تو دوسری زبانوں میں بھی روشن ہوا، ترجمے میں ان کی کتاب شعریات گرچہ مختصر ہے لیکن ارسطو کی بوطیقا کے ترجمہ کی وجہ سے بہت اہم ہے، یہ دراصل انگریزی سے ترجمہ ہے مگر اس میں انہوں نے کئی ترجموں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان لفظاً اور معناً دونوں کو اصل سے قریب رکھا، ترجمہ کی خوبی تو زبان داں جانیں لیکن بوطیقا کا جو تعارف فاروقی صاحب کے قلم سے ہے وہ ان کے مطالعہ اور اس سے بڑھ کر ان کی قوت اخذ و تجزیہ کا مظہر ہے جس میں انہوں نے خود یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ مکمل ہیئت اور اس کے اجزا کے آپسی رشتہ کا نظریہ پیش کر کے ارسطو نے افلاطون کی مشینی نقل کو بالکل منہدم کر دیا، ارسطو نے افلاطون کے اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ شاعری ایک طرح کے جنون کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن وہ یہ نہیں مانتا کہ شاعری مریضانہ ذہن کی پیداوار یا مریضانہ خیالات کو راہ دیتی ہے، اس موقع پر فاروقی صاحب نے جس طرح منشی حسین آزاد، میرؔ اور رسواؔ کو روسو شومان، شوپن ہار، جان اسٹورٹ مل کی فہرست میں شامل کر دیا ہے وہ خود ان کی اپنی سوچ کا ایک الگ پتہ ہے، فاروقی صاحب کا مطالعہ شاید برسوں تک طالب علموں کا محبوب مشغلہ رہے گا، اس سے اردو کو بہت زیادہ فائدہ نہ بھی ہو تو اس کی دلچسپی سے انکار بھی ممکن نہیں، ایک جگہ فاروقی اپنے خاندان کے ذکر میں ''کوریا پاری فاروقیوں کے ٹھسہ'' کی بات کرتے ہیں، اس کی تین علامتوں میں ایک وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ''دنیاوی اعتبار سے ان کا رتبہ کچھ ہو لیکن وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتے نہ تھے''، فاروقی صاحب کا مطالعہ کسی بھی اردو قاری کے لیے اس لحاظ سے آسان نہیں کہ بس ایک چاند سر آسماں ہو اور پھر جی بھر کر اس کو دیکھ لیا جائے، ان کا دائرۂ تحریر اپنے مطالعہ کی تعمیل میں جس تیزی سے پھیلتا ہے اور تنقید، تخلیق، نظریہ، قدامت، جدت، روایت، کلاسکیت اور پھر شعر و غیر شاعری اور پھر افسانہ اور داستان اور آخر کار ناول جیسے ادب و علم کے تمام بحر و بر کو سمیٹتا جاتا ہے وہ فاروقی صاحب کو ایک امتیازی شناخت تو ضرور دیتا ہے لیکن ان کا قاری بجائے مسحور ہونے کے بس بندۂ مجبور کی صورت ہو جاتا ہے، اسی بات کو شاید ان کی مرضی کے مطابق ان کی ایک کتاب ''تعبیر کی شرح'' کے آخری صفحہ پر ان کی تصویر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ''......فاروقی کا پورا سفر اس قدر وسیع اور پیچیدہ نظر آتا ہے کہ اس کی بابت کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے یہ خوف رہتا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو جائے......ان کا جستہ جستہ مطالعہ نہ صرف یہ کہ ان کے کام کی اصل قدر و قیمت جاننے میں مانع رہے گا بلکہ ایک حد تک

گمراہ کن بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح ہمیں جزو پر کل کا اطلاق کرتے ہوئے نتائج مرتب کرنے ہوں گے"۔

یہاں فاروقی صاحب کی زبان ترجمان ادب کے ان حوالوں کی ضرورت نہیں جو ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت اوران سے بھی پہلے آزاد وحالی وشبلی کی نوآبادیاتی اثرات سے متاثر شاعری کے تعلق سے ہیں اور جن کی وجہ سے اردوادب کی دنیا میں قریب تیس چالیس سال تک محاذ ومعرکہ آرائیاں ہوتی رہیں، نفی و اثبات کا ایک ہی کلیہ میں جتنا خوبصورت استعمال آل احمد سرور کے ہاں تھا فاروقی صاحب کے ہاں وہ ایک ٹھسہ والی شان سے نمایاں ہوتا نظر آتا ہے، جیسے وہ بیشتر ادبی تنقید کو افسوس ناک حد تک ژولیدہ فکری اور چھچھلے پن کا شکار دیکھتے ہیں، پھر چند سطروں کے بعد سردار جعفری یا احتشام حسین کو باعلم اور باذوق تو اس لیے مانتے ہیں کہ انہوں نے تنقید کو جس طرح برتا اس سے خدا اور وصال صنم دونوں سے بہرہ مند ہوتے رہے لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ غبی اور کم علم نقادوں کی وہ فوج جوان کی کلمہ گو ہے اس کے ہاتھ خط وخال کے علاوہ کچھ نہیں لگا۔

فاروقی صاحب کا یہی کمال ہے کہ تعزیتی مضمون میں بھی ان کے افکار کی جدت اور بہر صورت ان کی فتح کا یقین ان کی خوبیوں کی شکل میں قلم کی زبان پر آکر ہی رہتا ہے، ان کے اس رنگ کا سب سے شاندار ثبوت ان کا رسالہ شب خون ہے، اصلاً اپنے نام کی طرح اس نے اردو کے مسائل کو نذر طاق نسیاں نہ ہونے دیا، شب خون تو فاروقی صاحب کی مصروفیتوں اور شاید قویٰ کے اضمحلال کے سبب بند ہوکر ہزاروں کو سوگوار کر گیا لیکن بعد میں خبر نامہ کے طور پر اس کے چند شمارے خود فاروقی صاحب کو سمجھنے اور ان کی روح میں جھانکنے کا بڑا ذریعہ ہیں، ان خبر ناموں میں وہ موافق اور مخالف کی تفریق کے قطعی قائل نظر نہیں آتے ان کو ایسے جملے بھی اب نقش بر آب نظر آتے ہیں کہ "انہوں نے افسانے سے کہانی پن ختم کیا، ناول نگاری کو تباہ وتاراج کیا، تجریدی بے لطف افسانے کو فروغ دیا وغیرہ وغیرہ، اب نہ ظفر اقبال وغالب کا موازنہ رہ گیا بلکہ اس میں وہ سب کچھ لوگوں کو نظر آنے لگا جس سے سوچ اور علم کے چراغ روشن ہوتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ کہیں کہیں قصیدے کی نثریات بھی اتفاقاً نظر آجاتی ہیں۔

فاروقی صاحب کا یہ علمی مرتبہ ہی تھا جس کی وجہ سے معارف کی مجلس ادارت میں شامل ہونے کی ان سے درخواست کی گئی اور انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اسے قبول بھی کیا، دارالمصنّفین سے ان کی محبت وطن اور خونی رشتوں کی سی تھی، علامہ شبلی کی فارسی شاعری پر انہوں نے یہاں آکر ایک وقیع توسیعی

خطبہ دیا اور جب دارالمصنّفین کے سو سال پورے ہونے پر مدیر معارف پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے شذرات میں اپنے جذبات کی ساری کیفیات بیان کیں تو اس کو فاروقی صاحب نے من وعن خبرنامہ شب خون میں نقل کر کے ان حلقوں تک دارالمصنّفین کا پیغام پہنچا دیا جو عموماً معارف سے متعلق نہیں۔ فاروقی صاحب رخصت ہوئے تو درحقیقت اردو زبان کا عہد فاروقی بھی پورا ہوا، ان کو ان کے عہد کا ہر اعزاز ملا، آج کے اردو قاری کو بھی کہنے کا حق ہے کہ اس کو عہد فاروقی میں سانس لینے کا اعزاز ملا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

آہ! ظفر احمد صدیقی مرحوم

(۱۹۵۳-۲۰۲۰ء)

اگر کسی سال کو نام دیا جانا ضروری ہو تو سال گذشتہ کے لیے عام الحزن سے زیادہ مطابق حال کوئی اور نام شاید نہ ہوگا، دو دن ہی رہ گئے تھے کہ ۲۹ دسمبر کو یہ جانکاہ خبر ملی کہ ظفر احمد صدیقی جو چند ماہ پہلے شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے تھے اس دنیا سے بھی سبک دوش ہو کر رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب جناب شمس بدایونی نے ظفر صاحب کی سخت علالت یعنی نمونیہ کی اطلاع دی تھی، اس وقت یہ حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ علالت مرض الموت کی ابتدا ہے، دو تین دن پہلے ہی ان کے ممدوح ومداح اور ہر طرح سے قریب وعزیز جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا حادثۂ وفات پیش آیا، خدا جانے ظفر صاحب کو اس سانحہ کی خبر بھی ہوئی یا نہیں، لیکن ان دونوں مشاہیر کے انتقال کی خبر سے اردو دنیا جیسے سکتہ میں آ گئی، ایک کا ماضی جتنا شاندار تھا دوسرے کا حال و مستقبل، اردو دنیا کی زیب وزینت کا مبشر تھا، دونوں کا علم پختہ اور ذوق نہایت شستہ تھا، ایک کو میر کے شعروں نے مار رکھا تھا دوسرا غالب کا اسیر تھا، متقدمین شعرا کا کلام ہی ان کا پیام تھا، عربی اور فارسی ادبیات میں دونوں کو تبحر کا درجہ حاصل تھا، ان مناسبتوں کے ساتھ ظفر صاحب کی اپنی انفرادیت کچھ الگ شان بھی رکھتی تھی۔

ظفر صاحب مئو کے قریب مشہور مردم خیز بستی گھوسی میں ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے، گھرانہ قدیم مولویانہ رنگ کا تھا، ان کے والد مولانا وقار احمد صدیقی گھوسی کے امام عیدین تھے، بعد میں یہ وراثت ظفر صاحب کو بھی ملی، ان کی تعلیم گھوسی، الٰہ آباد، مراد آباد، سہارنپور اور لکھنؤ کے مشہور دینی مدارس میں

بالترتیب مدرسہ ناصر العلوم، وصیۃ العلوم، مدرسۃ الغربا مسجد شاہی، مدرسہ مظاہر علوم اور ندوۃ العلماء میں ہوئی، وہاں تعلیم کے ساتھ جس عالمانہ وضع قطع کے عادی ہوئے، بنارس اور علی گڑھ کی آب وہوا بھی اس عادت پر اثر انداز نہیں ہوئی، وقت کے مشہور علما مولانا جامی الہ آبادی، مولانا محمد یونس جونپوری، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی سے اکتساب فیض کی سعادت ملی، مشائخ مثلاً مولانا پرتاپ گڑھی، مولانا ابرارالحق، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا سراج مچھلی شہری، مولانا مفتی عبدالقدوس رومی الہ آبادی اور مولانا محمد اسعد اللہ اسعد کے فیض رشد وہدایت سے بھی سرفراز ہوتے رہے، بنارس یونیورسٹی میں مشہور محقق پروفیسر حنیف نقوی کے منظور نظر رہے، پروفیسر حکم چند نیر سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے، تعلیمی اسانید سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں قدیم وجدید کے جامع تھے، بنارس ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی دونوں جگہ لکچرر اور پروفیسر ہوئے، بظاہر یہ چند سطروں میں آجانے والی باتیں ہیں لیکن اس کے لیے صلاحیت ولیاقت کے کتنے اوزانوں اور پیمانوں سے انہیں گزرنا پڑا ہوگا اس کا حساب کون رکھے، کتابوں سے ایسا رشتہ اور مطالعہ کا ایسا جنون ہی ہر وادی پرخار کو گلزار بنا سکتا ہے، ۸۳ء میں بنارس سے ان کی ایک مختصر سی کتاب تنقیدی معروضات شائع ہوئی اور اس کے بعد کئی کتابیں سامنے آتی گئیں اور ان کے مطالعہ ونتائج مطالعہ کی پختہ مشقی کی سند بنتی گئیں، بنارس ہی میں تھے کہ پی ایچ ڈی کے لیے موضوع علامہ شبلی کی علمی وادبی خدمات کا چنا اور اس عقیدہ ویقین کے ساتھ چنا کہ علامہ قدیم وجدید کے امتزاج اور گوناگوں اوصاف وکمالات کی جامعیت کے لحاظ سے یگانہ روزگار تھے، شبلی کے مطالعہ میں ظاہر ہے سیرۃ النبیؐ پر نظر ناگزیر ہے، مقالہ نگار کی حیثیت سے ان کے قلم سے علامہ کی بعض کمیوں اور فروگذاشتوں کا ذکر آ گیا، معتقدین شبلی کے لیے یہ طالب علمانہ جسارت تھی اس لیے بعض مضامین بھی رد میں آ گئے، یہاں اعتراضات اور ان کے معقول ونامعقول کا ذکر ضروری نہیں اور اگر ضروری ہی ہو تو مولانا نعمت اللہ اعظمی کی رائے نقل کی جاسکتی ہے کہ ظفر صاحب کی کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ مصنف مرحوم کی عظمت اور ان کے احترام کو سامنے رکھ کر عالمانہ گفتگو کی ہے، ممکن ہے بعض مقامات پر ان کی رائے سے اتفاق نہ ہو اور صالح تنقید میں اس طرح کی گنجائش رہنی بھی چاہیے، تاہم انہوں نے اپنی بات کو دلائل کے ساتھ پیش کر کے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے، بہر حال یہ کہنا مناسب ہے کہ ظفر صاحب دل برداشتہ کیا ہوتے ان کی تحریروں کا زیادہ حصہ شبلی ہی کے لیے وقف ہو گیا، مقالہ تو ان کا چھپا ہی اور

۸۱ء تک کی شبلیات کے تناظر میں وہ اپنا مقام بنا گیا، ان کا یہ کہنا بھی واجب ٹھہرا کہ حیات شبلی میں شبلی کی قومی، مذہبی اور ملی خدمات کے بیان میں تو نہایت بسط سے کام لیا گیا لیکن ان کی علمی اور ادبی خدمات کے تفصیلی جائزے سے حیات شبلی تقریباً خالی رہ گئی، ظفر صاحب نے اس خلا کو کس حد تک پورا کیا یہ الگ بات ہے، لیکن اس بہانہ ان کے قلم سے شبلی، شبلی معاصرین کی نظر میں اور شبلی شناسی کے اولین نقوش اور شبلی بحیثیت سیرت نگار جیسی اعلیٰ درجہ کی کتابیں شبلیات کے ذخیرہ کو وقیع بنا گئیں، ان کا ایک بڑا کارنامہ نظم طباطبائی کی شرح دیوان اردوئے غالب کی ترتیب و تعلیق ہے، اس میں ان کے عالمانہ مقدمے کی تعریف معارف نے کئی صفحات میں کی، حالانکہ ان کے اس خیال سے اتفاق کم ہی کیا گیا کہ مشرقی شعریات سے واقفیت اور اس کے انطلاق و انطباق میں طباطبائی بسا اوقات حالی و شبلی سے آگے نکل گئے ہیں، حالانکہ دوسری سانس میں انہوں نے تسلیم کیا کہ طباطبائی کی نثر، شگفتگی اور سلاست اور روانی سے بڑی حد تک عاری ہے، بہرحال غالب کی اس پہلی مکمل شرح کی انہوں نے جس طرح تجدید و تزئین کی اور قریب ساڑھے سات سو صفحات میں اپنی ژرف نگاہی اور دیدہ ریزی کے نقوش ثبت کیے اس سے وہ اردو کے نئی نسل کے معتبر ترین محققوں بلکہ ناقدوں کی صف اول میں بڑی شان سے جگہ پا گئے۔

ان کی تصنیفات میں دیوان ناظم، انتخاب مومن، انتخاب آبرو، افکار و شخصیت، تحقیقی مقالات، مقالات نذیر، مثنوی موضع آرائش معشوق وغیرہ بھی ہیں اور ان سے ان کے خاص ادبی رجحانات کا اظہار بھی ہو جاتا ہے، ابھی چند ماہ قبل انہوں نے اپنی کتاب قصیدہ: اصل ہیئت اور حدود عنایت کی تھی اور معارف میں جلد سے جلد اس کے ذکر کی خواہش کا اظہار کیا تھا، کیا خبر تھی کہ اس جلد سے بھی جلد قدرت کا فیصلہ کچھ اور ہو چکا تھا، وہ رخصت ہوئے تو گویا ایک گلستاں نذر خزاں ہو گیا، ان کے مقالات و مضامین معارف کے علمی تسلسل میں بڑے معین و مددگار تھے، وہ دارالمصنّفین کے سیمیناروں میں آتے اور اپنے انداز بیاں اور مقالات کی جان سے خود جان محفل بن جاتے، یقیناً ان کا اس طرح رخصت ہو جانا اردو اور علمی دنیا کے لیے بڑا سانحہ ہے، مصائب کی کثرت کے باوجود یہ سانحہ عجب ہی محسوس ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔ (ع۔ص)

ادبیات

معارف

جناب وارث ریاضی

حضرت شبلی (۱) کی فکر و آگہی کا پاسباں
اے دبستاں سلیماں (۲) کا موقر ترجماں

تو معین الدین (۳) کی علمی بصیرت کا نشاں
تو صباح الدین (۴) کی فکر و نظر کی کہکشاں

اے شہاب الدین (۵) کے جہد و عمل کا رازداں
تجھ کو بخشا ہے ضیاء الدین (۶) نے زور بیاں

دل نشیں ہے محترم ظلی (۷) سے تیری داستاں
اے کہ تو ہے ان کے دم سے نازشِ ہندوستاں

تیری رفعت ہے حمید (۸) و ماجد (۹) و محمود (۱۰) سے
تیری عظمت ہے خلیق (۱۱) و بوالحسن (۱۲)، مسعود (۱۳) سے

عبد باری (۱۴) و سعید (۱۵) و بوظفر (۱۶)، عبد السلام (۱۷)
عبد رحمٰن (۱۸) و ریاست (۱۹) سے ترا اونچا مقام

تو نذیر (۲۰) و آرزو (۲۱)، محفوظ (۲۲) کی روح رواں
اے کہ تو ہے رابع (۲۳) ندوی کی بزم ضو فشاں

تھا ریاضِ (۲۴) علم کے پیکر کا یہ اچھا خیال
''تیرے مرکز پر نہیں آیا کبھی علمی زوال''

ہے شریف (۲۵) قاسمی سے تیری محفل لاجواب
التفاتِ فخر (۲۶) سے تو بامراد و کامیاب

اس طرح تو نے سنوارا فکر شبلی کا چمن
جس کے گل چیں ہیں ہزاروں کا ملانِ علم و فن

مستند شاعر، مصنف، ناقدِ بالغ نظر
سیکڑوں پیدا کیے ہیں علم کے شمس و قمر

ربط محکم تھا ترا اقبال (۲۷) سے آزاد (۲۸) سے
تیرا مستحکم تعلق حضرت آزاد (۲۹) سے

حضرت اقبال (۳۰) و احساں (۳۱) تیرے فرزانوں میں تھے
ماہرِ (۳۲) جادو بیاں بھی تیرے دیوانوں میں تھے

تجھ سے وابستہ رہے شاد (۳۳) و صفی (۳۴) حسرت (۳۵) اثر (۳۶)
اکبر (۳۷) و سیماب (۳۸) و جوش (۳۹) و حضرت تسکیں (۴۰)، جگر (۴۱)

امجد (۴۲) و ثاقب (۴۳) عزیز (۴۴) و جوہر (۴۵) شیریں بیاں
تھی روش (۴۶) کی فکر سے محفل تری ندرت فشاں

دل کشی تیری رہی کچھ دن بہ فیضانِ نعیم (۴۷)
ان کا احساں بھی ترے اوراق پر مثل نسیم

☆ کاشانۂ ادب، سکٹا، دیوراج، پوسٹ بسوریا، ضلع مغربی چمپارن (بہار)، موبائل: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

ہے عمیر (۴۸) عالم دیں سے ترا فضل و کمال ڈاکٹر الیاس (۴۹) سے بھی ہے ترا حسن و جمال
تیرے عظمت آشنا جمشید(۵۰) و توقیر(۵۱) و کلیم(۵۲) رشک کے قابل ہیں جن سے تیری خدمات عظیم
تو جہانِ علم و فن میں بے مثال و بے نظیر علم کی دنیا تیرے احسان سے ہے مُستنیر
اے معارف! قدرداں تیرے رئیس(۵۳) خوش بیاں وارث (۵۴) ناچیز کے شعر و سخن تجھ سے جواں

حوالہ جات

(۱) علامہ شبلی نعمانیؒ (۲) مولانا سید سلیمان ندویؒ (۳) مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔ (۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ (۵) سید شہاب الدین دسنوی۔ (۶) مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔ (۷) پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ (۸) علامہ حمید الدین فراہی۔ (۹) مولانا عبدالماجد دریابادی۔ (۱۰) ڈاکٹر سید محمود مرحوم۔ (۱۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ (۱۲) مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ (۱۳) مولانا مسعود علی ندوی۔ (۱۴) مولانا عبدالباری ندوی۔ (۱۵) مولانا سعید انصاری۔ (۱۶) مولانا سید ابوظفر ندوی۔ (۱۷) مولانا عبدالسلام ندوی۔ (۱۸) مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی۔ (۱۹) مولانا ریاست علی ندوی۔ (۲۰) پروفیسر نذیر احمد۔ (۲۱) پروفیسر مختار الدین احمد آرزو۔ (۲۲) مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی۔ (۲۳) مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ۔ (۲۴) پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی۔ (۲۵) پروفیسر شریف حسین قاسمی۔ (۲۶) ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی۔ (۲۷) علامہ اقبالؒ۔ (۲۸) مولانا ابوالکلام آزاد۔ (۲۹) پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ (۳۰) علامہ اقبال سہیل۔ (۳۱) مرزا احسان احمد۔ (۳۲) ماہر القادری مدیر فاران کراچی۔ (۳۳) شاد عظیم آبادی۔ (۳۴) صفی لکھنوی۔ (۳۵) مولانا حسرت موہانی۔ (۳۶) اثر لکھنوی۔ (۳۷) اکبر الہ آبادی۔ (۳۸) علامہ سیماب اکبر آبادی۔ (۳۹) جوش ملیح آبادی۔ (۴۰) تسکین قریشی۔ (۴۱) شہنشاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی۔ (۴۲) امجد حیدر آبادی۔ (۴۳) ثاقب لکھنوی۔ (۴۴) عزیز لکھنوی۔ (۴۵) مولانا محمد علی جوہر۔ (۴۶) روش صدیقی۔ (۴۷) مولانا ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی۔ (۴۸) مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی مدظلہ۔ (۴۹) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ (۵۰) ڈاکٹر جمشید عالم ندوی۔ (۵۱) مولانا حافظ توقیر احمد ندوی۔ (۵۲) کلیم صفات اصلاحی۔ (۵۳) ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی۔ (۵۴) وارث ریاضی

بارہویں شعر کے پہلے مصرعے میں آزاد سے مولانا ابوالکلام آزاد مراد ہیں اور دوسرے مصرعے میں آزاد سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اس لیے یہاں ایطا کا سقم نہیں ہے۔

زوالِ غرب

پروفیسر اخلاق آہن

زوال کیوں شروع ہوتا ہے، دیکھ مغرب کو
جمود عیش و ترقی سے ہیں نڈھال یہ لوگ
نہ جوش و جستجو دنیا نئی بنانے کی
نہ کوئی سوز ہی ان میں زمانہ زدگاں کا
ستم رسیدہ جہاں کے نہ نالے سنتے ہیں
نہ فکر دیشب و امروز کی گراں باری
دھکیل آئے ہیں میراث، کہنہ خانوں میں
تمام مذہب و اقدار بھول آئے ہیں
وہ انکشاف فلاطوں، شروح سینائی
وہ ابتدائے داوِنچی، مقال شوپنہار
وہاں پہ گرد و غبار ہوس کی سرتابی
تمام جسم میں جرثومہ حرصِ اشیا کا
شجر تمام یہ اب سوکھنے ہی والا ہے
بِنا میں اس کے خباثت کی تخم کاری ہے
زوالِ غرب ہے اب اک حقیقتِ مبرم!

جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی -۶۷۔

مطبوعات جدیدہ

تفکر قرآن از مولانا عبدالسلام ندوی، ترتیب: ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ

کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ۸-پہلا منزلہ، ہندوستان بلڈنگ، ۲/۱۰ ٹی، پی اسٹریٹ، ممبئی ۴۰۰۰۰۴۔

مولانا عبدالسلام ندوی صاحب اسوۂ صحابہ واقبال کامل کا کوئی تعارف کرائے، وہ علامہ شبلی کے چہیتے شاگرد اوران کی امیدوں کے مرکز ہی نہیں تھے، دارالمصنّفین کی اعلیٰ علمی وادبی وتاریخی و شعری روایتوں کے مرکزی کردار تھے،ان کے علم کی بے کرانی کو سمجھنے کے لیے یا محض بیان کرنے کے لیے ایک سفینہ چاہیے، کتابوں کا ذکر تو الگ ہے معارف میں ان کے مضامین سمندر کی لہروں کی طرح موجزن ہیں، کیسے کیسے علم وحکمت کے موتی نظر آتے رہتے ہیں، مولانا اس عہد اوراس نسل کے نمائندہ ہیں جہاں قرآنی علوم کو نئے سرے سے بلکہ اولیت کے درجہ سے مطالعہ کا موضوع بنایا گیااور شاید ہندوستان کی پوری علمی تاریخ میں یہ دور قرآنیات کے لحاظ سے سب سے وقیع زمانہ ثابت ہوا، غالباً یہی وجہ تھی کہ تذکرہ، سیر، سوانح، ادب اور تاریخ کے موضوعات پر نہ رکنے والا قلم ،قرآن مجید کے مضامین سے غافل نہ رہ سکا، معارف میں ان کے مضامین کے عنوانات ہی بتاتے ہیں کہ مولانا کا قلم کن قرآنی گوشوں تک جا پہنچتا تھا، معجزہ قرآنی کی نوعیت، خصائص قرآن مجید، کیا قرآن مجید میں شاعری نہیں ہے، سورۂ قیامہ کے چند نکات، استفسار وجواب ابولہب، برکاتِ آسمانی اور قرآن مجید، تحریم سود علل اور اسباب، زکوٰۃ یا خیرات، قصص الانبیاء اور قرآن مجید، مسلمانوں اور عیسائیوں کی مودت، تحریفات یہود اورنزول القرآن علی سبعۃ احرف، یہ وہ مضامین ہیں جو معارف کے دامن میں لعل وگہر کی طرح موجود بھی ہیں اور مخفی بھی، اللہ تعالیٰ ہمارے ہارون بھائی کی مغفرت فرمائے کہ انہوں نے صرف مولانا مرحوم کا حق قرابت ہی ادانہیں کیا،ان کے علوم کی اشاعت کا وہ کام کیا جو برسوں کسی اور سے نہ ہوسکا، ہارون بھائی مرحوم مردم شناس بھی تھے، کام کے لیے موزوں انتخاب بھی بڑی خوبی ہے، ان مضامین کو جمع کرنے، ابواب میں تقسیم کرنے اوران کا جامع تعارف کرانے کے لیے انہوں نے بجا طور پر ابوسفیان اصلاحی صاحب کو ذمہ داری سونپی، نتیجہ میں ایک نہایت قابل قدر کتاب سامنے آگئی، کتاب بہت پہلے چھپی اور غفلت کی حد ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی ہی کی کتاب پر اتنی تاخیر سے معارف میں ذکر آیا،

خدا معاف فرمائے لیکن یہ کتاب جب بھی قاری کے ہاتھوں میں ہوگی اس کے دل پر نزولِ کتاب کی کیفیت تازہ ہوکر طاری ہوگی۔

چند اہم علمی وفکری خطبات از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۴۵۶، قیمت درج نہیں، پتہ: المعہد الاسلامی، شاہین نگر، حیدرآباد، تلنگانہ اور حیدرآباد و سہارن پور واندور کے مکتبے۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب بھی ملت کی خوش قسمتی سے ان علمائے امت بلکہ کبار علماء امت سے ہیں جن کی تحریر وتقریر کا مقصد قوم میں اعلیٰ علمی ذوق کی افزائش ہے، ان کو فقیہ العصر کہا جاتا ہے، مبالغہ بھی ہو تو یہ عیب نہیں، انہوں نے زمانہ کی فقہیات کی ترجیحات کو ایک نئی شکل دی، اب اسی کتاب میں اصول قانون، عصر حاضر کے مسائل، اختلاف کے آداب، انسانی حقوق، اقلیتوں کے حقوق، آزادی کا تصور، مسلمانوں اور غیروں کے روابط، بین مذہبی مذاکرات، غلو اور تجدد، اسلامی اقتصادیات کی مدارس میں تعلیم وغیرہ جیسے موضوعات ہیں، صحیح بات ہے کہ یہ اگرچہ خطبے ہیں لیکن ہمارے علمائے سلف کے خطبات کے مجموعوں کو دیکھیں تو ان میں ربط مضمون اور مرکزی موضوع سے قربت اور خطابت کی بعض کمزوریوں کے باوجود داعیانہ دردمندی کی خوبی کا جو منظر ہے وہ ان خطبات کو بھی اسی درجہ مفید اور وقیع اور پڑھنے کے لائق بناتا ہے۔

سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب از ڈاکٹر عطا عابدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۰۴، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴ کے علاوہ ملک کے قریب سبھی مشہور مکتبے۔

سقوط ماسکو یعنی کمیونزم کے زوال نامہ کی آخری مہر اور یہ مہر معمولی درجہ کی نہیں، ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد دنیا کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور ادبی آفاق وابعاد پر نئے اور بڑے گہرے بادل چھائے اور یہ اتنے گھنے اور خوفناک تھے کہ کمزور یقین والوں کو ان کے چھٹنے اور آسمان صاف ہونے کی امید تک نہیں رہی تھی، ادب عالمی طور پر اس کے اثرات سے محفوظ کیوں رہتا، اردو ادب نے بھی انقلابی خوش گمانیوں میں اپنے ادب پر ترقی پسندی کی ردا یا عصمت چغتائی کا لحاف ڈال لیا، اثرات ہوتے ہیں تو اچھے اور برے کا فرق بھی لیے ہوتے ہیں، اصل معاملہ عقیدہ کا تھا کہ اشترا کی فلسفہ کی تہہ میں کیا ہے؟ اور یہیں ان سے بھی چوک ہوگئی جو قلم کی حرمت اور شرافت کے منکر نہیں تھے،

ترقی پسندی، اشتراکیت، نظریاتی عروج وزوال وغیرہ اب بھی ادبی مباحثہ کا حصہ ہیں، اس کتاب میں رسالہ افکار ملی کی ان بحثوں کو جمع کیا گیا ہے جن میں ترقی پسند ادب سے متعلق کچھ سوالات تھے، جو ملک کے بعض معروف اہل قلم کے ذہن ومزاج پر دستک دینے کے لیے تھے، خوشی کی بات اس مباحثہ کے منتظمین اور شرکا کے لیے یہ تھی کہ ان مباحث پر کھلے ذہن سے خیال کو اظہار کی اجازت ملی، مرتب کا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ کسی ایک عنوان پر مکالمہ یا مذاکرہ میں اتنے اور ایسے ادبی حضرات کی شرکت کی مثال نہیں ملتی، خوبی یہ تھی اور ہے کہ اختلاف کے آداب لوگوں کے سامنے رہے کہ وسیع القلبی کے ساتھ سننے، سمجھنے کے اخلاقی ضابطے ہیں، ان کا لحاظ ہی بحث کو قدر کے لائق بناتا ہے، مرتب خود نہایت شائستہ فکر و اسلوب کے حامل ہیں، اس لیے ایک الگ موضوع پر بڑے سلیقہ سے مطالعہ کے لائق کتاب تیار ہوگئی۔

یادگار عزیز اندوری از پروفیسر حدیث انصاری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۳۶، قیمت ۳۷۱ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵۔

کتنے ہی ایسے علم وفضل کے پیکر ہیں جو خاموشی سے کہہ جاتے ہیں کہ درس تہذیب ہنر لینا ہو تو مجھے پڑھ کر دیکھیں، کتابوں میں حوالے کہاں تک ڈھونڈے جائیں، عزیز اندوری نے یہ بات اپنے ایک شعر میں کہی تو کچھ غلط نہیں کہا، اردو کی جہاں گیری کی باتیں تو خوب ہوتی ہیں لیکن میدان عمل بس چند ہی شمار میں آتے ہیں، راجپوتانہ، میواڑ اور سرزمین مالوہ پر نگاہیں کم ہی جاتی ہیں، یہ کتاب اس لیے بھی اچھی لگی کہ اس میں مالوہ کی شبوں کو حسن تعبیر دینے والے ایک خادم اردو کی بڑی پیاری داستان آ گئی ہے، فاضل مصنف نے کھل کر اعتراف بھی کیا اور شہادت بھی دی کہ عزیز اندوری نے اپنی شخصیت اور فکر وفن کی شناخت کے مختلف زاویے اور آئینے خود کی ریاضت، محنت اور خلوص و وفا سے بتائے ہیں، اصلاً یہی اوصاف انسان کی زندگی اور اس کے اعمال کو کمال میں بدل دیتے ہیں، سوانح کے جتنے رائج طریقے ہیں کتاب نے ان سے انحراف نہیں کیا، شخصی حالات وکوائف پھر فکری وتخلیقی سفر کے مختلف مراحل جیسے غزل ونظم گوئی، نثر نگاری اور پھر اس میں ڈرامہ، خاکہ، انشائیہ، طنز ومزاح نگاری اور تحقیق و تنقید وترجمہ نگاری وغیرہ سلیقہ سے زیر بحث آ گئے ہیں، شروع میں خطہ مالوہ خصوصاً علاقہ دھار اور اندور کی تاریخ نے کتاب کی افادیت اور دلچسپی میں بڑا اضافہ کر دیا، جن لوگوں کو شب مالوہ کی لطیف ہواؤں

اور دھار کی قدامت اور مانڈو میں عشق وجذب کی مستی کی کیفیتوں کی نعمتوں سے شناسائی ہے وہی اس علاقہ کی اہمیت اور پھر مسلمانوں کی حکمرانی کی جلوہ سامانیوں کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، یہ کتاب صرف ایک فاضل اہل قلم ہی سے نہیں ان اسباب وعوامل سے بھی روشناس کراتی ہے جن سے کوئی بھی ماحول گلزار کی صورت میں مہک جاتا ہے۔

دیوان صفدر از حضرت شاہ صفدر حسین قادری مجددی، رام پوری، مرتبہ: **جناب محمد مظاہر اللہ خان** وجیہی، متوسع تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۷، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ، بازار مسٹن گنج، رام پور-۲۴۴۹۰۱ (یو، پی)

پر کیف نعتوں، منقبتوں، نظموں، سہروں، تاریخی قطعوں پر مشتمل اس مختصر لیکن روح پرور مجموعہ کی ایک خاص بات واقعہ معراج کے تعلق سے منظومات بھی ہیں، مرتب جو خود صاحب نسبت ہیں اور ادارہ فرقانیہ کی علمی ودینی اور اصلاحی روایتوں کے امینوں میں ہیں، انہوں نے دو لفظوں میں حضرت صفدر کا تعارف کرادیا کہ وہ شیدائے رسولؐ وبلبل فرقانیہ تھے اور دلیل میں جس شعر سے ابتدا کی وہی اس مجموعہ کی قدر کے لیے کافی ہے کہ:

نبیؐ کی نعت، تیرا منہ ہے صفدرؔ
ٹٹولو تو ذرا منہ میں زباں ہے

ایک شعر جسے نیرنگی خیال کی مثال میں پیش کیا گیا ہے، بار بار داد طلب ہے:

صورت جو تھی آپ کو دکھانی
موسیٰ سے کہا لن ترانی

ایک شعر اور ملاحظہ کیجیے، کیا رام پوری رنگ ہے:

بیمار ہو کوئی تو وہ اپنی دوا کرے
تم پر جو مر رہا ہو بتاؤ وہ کیا کرے

یہ مجموعہ واقعی عطر مجموعہ ہے، اس خوشبو کو حق ہے کہ ہر مشام جاں کو معطر کردے۔

(ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

تذکرہ شعرائے بریلی: ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، اپلائڈ بکس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی،

قیمت ۷۰۰ روپے

خطوطِ شبلی بنام شروانی: فیصل احمد ندوی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامع مسجد اردو بازار، دہلی

قیمت ۴۰۰ روپے

راہِ حق کا مسافر: محمد رفیق کلوری عمری، ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام عمر آباد، ٹمل ناڈو

قیمت ۱۲۰ روپے

رباعیات (شعری مجموعہ): سلمان احمد رباب رشیدی، دانش محل جھنڈے والا پارک، امین آباد، لکھنؤ

قیمت ۳۰۰ روپے

سبیل العارفین: مولانا محمد اویس قاسمی اعظمی، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ، دہلی قیمت ۱۰۰ روپے

گنجینۂ معنی: ڈاکٹر سرفراز احمد خان، دانش محل، امین آباد، لکھنؤ قیمت ۶۰۰ روپے

متاعِ دل و جان: چودھری معین الدین عثمانی مرحوم، مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

قیمت ۲۰۰ روپے

مضامینِ حکمت: مرتب مولانا محمد اویس قاسمی، مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد، مئو قیمت ۸۰ روپے

میرے اساتذہ: مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری، ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دار السلام عمر آباد، ٹمل ناڈو

قیمت ۱۰۰ روپے

نعتیں (مجموعۂ نعت): سلمان احمد رباب رشیدی، ۶۵-تارین، شاہجہاں پور قیمت ۳۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن) 2000/-

سیرۃ النبیؐ

(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) 2200/-

علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی

مقدمہ سیرۃ النبیؐ 30/-

الفاروق 350/-

الغزالی 200/-

المامون 175/-

سیرۃ النعمان 300/-

سوانح مولانا روم 220/-

شعر العجم اول 300/-

شعر العجم دوم 150/-

شعر العجم سوم 125/-

شعر العجم چہارم 200/-

شعر العجم پنجم 150/-

الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی 350/-

(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی

الکلام 250/-

علم الکلام 200/-

موازنہ انیس و دبیر 250/-

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر 100/-

سفرنامہ روم و مصر و شام 200/-

کلیات شبلی (اردو) 220/-

کلیات شبلی (فارسی) 45/-

مقالات شبلی اول (مذہبی) 170/-

مرتبہ: سید سلیمان ندوی

مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃 70/-

مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃 80/-

مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃 200/-

مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃 150/-

مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃 90/-

مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃 100/-

مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃 110/-

خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی 150/-

انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی 45/-

مکاتیب شبلی اول 〃 150/-

مکاتیب شبلی دوم 〃 190/-

اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات) 250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
FEBRUARY 2021 Vol - 207 (2)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)